Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

یکم جون ۲۰۱۸ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۱ ۔ شمارہ نمبر: ۱۱

پندرہ روزہ
معارف فیچر کراچی
MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، سید سمیع اللہ حسینی، نوید نون ۔ معاون مدیر: غیاث الدین

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰
فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰(۲۱۔۹۲)، فیکس: ۳۶۳۶۱۰۴۰
برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔
۲۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔
۳۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔
۴۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔
۵۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

چین: میری ٹائم سلک روڈ کے خطے پر تزویراتی اور معاشی اثرات

Michael J. Green

چین نے اکیسویں صدی کے میری ٹائم سلک روڈ کا تصور ۲۰۱۳ء میں پیش کیا، جس کے ذریعے بحرالکاہل، جنوب مشرقی ایشیا، بحر ہند اور مشرقی افریقا کو جوڑنے کے لیے انفرااسٹرکچر کی تعمیر کا اعلان کیا گیا۔ میری ٹائم سلک روڈ سمندری راستہ ہے، جس سے اقتصادی راہداری کی تکمیل ہوگی، اس منصوبے کے تحت پورے وسط ایشیا میں انفرااسٹرکچر کی تعمیر پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ ون بیلٹ ون روڈ منصوبے کا ایک مقصد پورے ایشیا میں چین کے اثر و رسوخ کو بڑھانا بھی ہے۔ ایشیا کے ترقی پذیر ممالک میں انفرااسٹرکچر پر سرمایہ کاری کی شدید کمی ہے۔ اس لیے خطے کے زیادہ تر ممالک نے چین کی سرمایہ کاری کا خیر مقدم کیا ہے۔

چین کی پیشکش کے حوالے سے معاشی استحکام اور سیاسی و جغرافیائی ارادوں پر سوالات بڑھتے جا رہے ہیں، اس منصوبے کا مقصد بنیادی طور پر بحر ہند کے ممالک کو باہم جوڑنا ہے۔ اس منصوبے میں خاص طور پر بندگاہوں کی تعمیر کو اہمیت دی گئی ہے، جس کی وجہ سے سوال اٹھ رہا ہے کہ یہ منصوبہ صرف معاشی اور سرمایہ کاری کے لیے ہے یا پھر اس کے عسکری مقاصد بھی ہیں۔ اس حوالے سے بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری وصول کرنے والے ممالک کی قومی اور خارجہ پالیسی پر چین کے ممکنہ اثرات کے خدشات بھی پائے جاتے ہیں۔ اس ساری صورتحال کی روشنی میں سی ایس آئی ایس نے ۷ ماہرین پر مشتمل کمیشن قائم کیا، جو میری ٹائم سلک روڈ منصوبے کے تحت بحر ہند میں چین کے ترقیاتی منصوبوں کے معاشی اور جیو اسٹریٹیجک اثرات کا جائزہ لے گا۔ ان ماہرین کی تحقیق اس رپورٹ میں پیش کی گئی ہے، اس مضمون میں انفرااسٹرکچر کے ۴ منصوبوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ جس میں ۳ میری ٹائم سلک روڈ کے چینی منصوبے ہیں اور ایک اس کے جواب میں بھارتی منصوبہ ہے۔ چینی منصوبوں میں میانمار کا ''Kyaukpyu''، سری لنکا کا ''ہامبانتوتا''، پاکستان کا ''گوادر'' شامل ہیں جبکہ بھارت ایران میں ''چاہ بہار'' بندرگاہ کی تعمیر کے منصوبے پر کام کر رہا ہے۔

گریگ پولنگ نے راخائن میں خلیج بنگال کے کنارے موجود Kyaukpyu بندرگاہ پر چینی سرمایہ کاری کے معاشی اور تزویراتی مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ چین نے حال ہی میں گہرے پانی کی بندرگاہ Kyaukpyu اور اس سے ملحقہ انڈسٹریل ایریا اور اقتصادی زون تعمیر کرنے کا ٹھیکہ حاصل کیا ہے۔ جنوب مغربی چین کے صوبے ''یوآن'' کے دارالحکومت Kunming کو قدرتی گیس اور تیل کی فراہمی کی لائنیں بھی Kyaukpyu سے گزرتی ہیں۔ یہ منصوبہ تیل اور گیس کی درآمدات کے لیے آبنائے مالاکہ پر چین کا انحصار کم کرنے کے لیے اس کی تزویراتی کوششوں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح Kyaukpyu میں گہرے پانی کی بندرگاہ کی تعمیر سے چین کو اپنے اندرونی صوبوں کی تعمیر و ترقی میں مدد ملے گی۔ گریگ پولنگ نے خطے میں موجود ان خدشات کا بھی حوالہ دیا ہے، جن کے تحت یہ کہا جا رہا ہے کہ چین اس گہرے پانی کی بندرگاہ کے معاشی استعمال کے ساتھ ساتھ اس کا فوجی استعمال بھی کر سکتا ہے۔ گریگ کے نزدیک فی الحال سب بڑا خطرہ یہ ہے کہ چین میانمار کو قرض دے کر اس کی معیشت کو مکمل طور پر قابو کرتا جا رہا ہے۔

ہامبانتوتا (سری لنکا)

جوناتھن ہیل مین نے سری لنکا کی بندرگاہ ہامبانتوتا پر چین کے ترقیاتی منصوبے کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے خدشہ ظاہر کیا کہ کولمبو کی بندرگاہ کی موجودہ صلاحیت اور توسیع منصوبے کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہامبانتوتا کی بندرگاہ پر چینی بحریہ ممکنہ بحری اڈہ تعمیر کر سکتی ہے۔ جوناتھن کا کہنا ہے کہ جس طرح سری لنکا نے ۹۹ سالہ لیز پر یہ بندرگاہ چین کے حوالے کی ہے اس سے خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ چین سری لنکا کو بھی قرض کے جال میں پھنسا رہا ہے۔ جوناتھن کا کہنا ہے کہ ہامبانتوتا کا کیس یہ سبق دیتا ہے کہ جن ممالک میں اس طرح کے منصوبوں پر کام ہو رہا ہے انھیں اپنے انفرااسٹرکچر کی تعمیر کے لیے طویل المیعاد معاہدوں پر دستخط کرنے چاہیے تاکہ وہ قرضوں کے جال میں نہ پھنس جائیں، اور اس کے ساتھ ہی بین الاقوامی برادری کو بنیادی منصوبوں کے لیے چین کی مالی امداد کا متبادل فراہم کرنے کی ضرورت ہے۔

اندرونی صفحات پر:۔

- کون ہوگا محمود عباس کا جانشین؟
- فلسطین ایک پٹی ہوئی فلم ہے؟
- غزہ: میں نے مارچ میں شرکت کیوں کی؟
- ایران مسائل کی جڑ، یا اُن کا حل!!
- اسرائیل کا سوویٹو
- ''جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے''
- اسلحہ کی عالمی تجارت میں چین کا نمایاں کردار
- غیر معمولی مستقبل کی تلاش

گوادر (پاکستان)

گرمیت کنول کے مطابق گوادر بندرگاہ کی تعمیر چین پاکستان اقتصادی راہداری منصوبے کا اہم ترین حصہ ہے۔ سی پیک پاکستان اور چین کے درمیان مضبوط تعلقات کی علامت بن چکا ہے۔ گرمیت کے مطابق دونوں ممالک ہی سی پیک کے حوالے سے خدشات کا شکار ہیں۔ چین کو اپنے مزدوروں کی سلامتی کے حوالے سے خدشات ہیں تو پاکستان کو پریشانی ہے کہ سی پیک کے نتیجے میں قرضوں میں بے پناہ اضافہ ہوجائے گا، جس سے کشیدگی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔ گرمیت نے بحر ہند کے گیٹ وے ''گوادر'' تک چینی بحریہ کی ممکنہ رسائی کے سیکیورٹی اثرات کا بھی جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے خطے میں چین کے بڑھتے ہوئے اسٹریٹیجک اثرات سے نمٹنے کے لیے بھارت، جاپان، آسٹریلیا اور امریکا کے درمیان بات چیت اور تعاون کی نشاندہی بھی کی ہے۔

چاہ بہار (ایران)

ہرش پینٹ کے مطابق چین انفراسٹرکچر سرمایہ کاری کے ذریعے ''گریٹ گیم'' کھیلنے والا تنہا ملک نہیں، بلکہ بھارت بھی اس ڈور میں شامل ہے۔ بھارت کا ایران کی چاہ بہار بندرگاہ کی تعمیر میں مدد کرنا دہلی کے عزائم کی عکاسی کرتا ہے۔ بھارت خطے کو جوڑنے کے لیے خاص کر افغانستان تک رسائی کے لیے انفراسٹرکچر کو بہتر کر رہا ہے۔ چاہ بہار بندرگاہ چین کے تعاون سے تعمیر ہونے والی گوادر بندرگاہ کے قریب واقع ہے۔ چاہ بہار بندرگاہ خطے میں اسٹریٹیجک حیثیت رکھتی ہے، جس کے ذریعے چین کے خطے میں بڑھتے ہوئے اثرات کو کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ ہرش نے بھارتی حکمت عملی میں پیچیدگی کی نشاندہی بھی کی ہے، جس کی وجہ ایران کی جانب سے چاہ بہار بندرگاہ کی تعمیر میں پاکستان اور چین کا کردار قبول کرنا ہے۔

ان چار منصوبوں کے تجزیہ کے علاوہ دو مضامین اور بھی ہیں، جن میں چین کے میری ٹائم سلک روڈ کے معاشی اور دفاعی اثرات پر تبصرہ کیا گیا ہے۔

میتھیو اور جوناتھن نے بحر ہند کی تجارتی اہمیت کو اجاگر کیا ہے، مثال کے طور پر دنیا کی ۱۰ مصروف ترین تجارتی بندرگاہیں بحر ہند میں واقع ہیں۔ دنیا بھر میں تیل کی آدھی تجارت بحر ہند کے ذریعے ہی ہوتی ہے۔ چین کی سرمایہ کاری معاشی مقاصد رکھتی ہے یا اسٹریٹیجک؟ چینی منصوبے کے نتیجے میں معاشی استحکام کا اندازہ لگانے کے لیے میتھیو اور جوناتھن نے تین مختلف معیار اور اصول متعارف کرائے ہیں، شپنگ لائنز کو قریب لانا، موجودہ بندرگاہوں میں فاصلے کم کرنا اور ملک کے اندرونی علاقوں کو بندرگاہ سے جوڑنے کے لیے سڑکوں کی تعمیر۔ میتھیو اور جوناتھن کے مطابق چینی منصوبے کو ان تین معیار پر رکھ کر جانچنے سے پتا لگا کہ اس منصوبے کو معاشی مقاصد سے جوڑنا غلط ہے۔ زیک کوپر کے مطابق بحر ہند میں چینی فوجیوں کی موجودگی میں اضافہ حیرت انگیز نہیں ہے، چین بھی ابھرتی ہوئی طاقتوں کے روایتی راستے پر گامزن ہے۔ چین بیرون ملک اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے اپنے فوجی آپریشنز میں توسیع کر رہا ہے۔ بحر ہند کے راستوں پر چینی تجارت کا انحصار بہت زیادہ ہے، یہ تجارتی راستے چین کے لیے بہت اہم ہیں، خاص کر توانائی کی فراہمی کے لیے، اس لیے چینی حکومت کی جانب سے بحر ہند میں اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ایک قدرتی امر ہے۔

زیک کے خیال میں بحر ہند میں چینی فوج کی موجودگی کے سیکیورٹی اثرات ملے جلے ہوں گے۔ ان کوششوں سے خطے میں چین کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوجائے گا۔ زمانہ امن میں قزاقوں کے خلاف آپریشنز اور خطے کی دیگر افواج سے تعاون پر چین کے بحری جہازوں کو بحر ہند کی بندرگاہوں تک رسائی مل سکتی ہے، جہاں سے وہ تیل اور دیگر سپلائی کا سامان حاصل کر سکتے ہیں۔ زمانہ جنگ میں بحر ہند میں موجود چین کے بحری جہاز اور اڈے دشمن کے لیے آسان ہدف ثابت ہوں گے۔ اس سب کے باوجود مستقبل میں بحر ہند میں چین کے سیاسی، معاشی اور عسکری اثر و رسوخ میں اضافہ ہوگا، جس کی وجہ سے بحر ہند کے حوالے سے حکمت عملی بنانے والوں میں تشویش رہے گی۔ بحر الکاہل سے مشرق وسطیٰ جانے والے اہم راستے، خلیج ہرمز اور آبنائے مالاکہ کے چیک پوائنٹس کے حوالے سے امریکا اور آسٹریلیا میں تشویش پائی جاتی ہے۔ خطے میں چین کے بڑھتے اثرات سے جاپان بھی تشویش میں مبتلا ہے۔ بھارت بھی بحر ہند میں چین کی جانب سے بنائی جانے والی ''موتیوں کی مالا'' (کی مانند بندرگاہیں) سے پریشان ہے۔ ہمالیہ میں جاری چین اور بھارت کی طویل مسابقت کے پس منظر میں ان بندرگاہوں کی وجہ سے خطے میں چین کو نئے اختیارات حاصل ہوجائیں گے۔ گریگ کے مطابق میری ٹائم سلک روڈ کی وجہ سے پیدا ہونے والی غیر یقینی صورتحال کا امریکا، جاپان، بھارت اور آسٹریلیا اپنے حال ہی میں قائم ہونے والے اتحاد کے ذریعے جواب دے سکتے ہیں۔

جسکی برکر اور اینڈریو نے چار ملکی سیکورٹی ڈائیلاگ (کواڈ) کے تاریخی کردار کا جائزہ لیا ہے۔ یہ چار ملکی گروپ آسٹریلیا، جاپان، بھارت اور امریکا نے ۲۰۰۴ء میں بحر ہند میں سونامی کے بعد انسانی مدد کے لیے قائم کیا تھا۔ چین کے ممکنہ ردعمل کے خدشے کی وجہ سے چاروں ممالک باقاعدہ طور پر گروپ کو فعال نہیں کر سکے تھے، مگر اب چاروں ممالک نے کواڈ کو دوبارہ سے فعال کردیا ہے۔ جو تجزیہ نگاروں کے مطابق خطے میں چین کی بڑھتی معاشی اور عسکری سرگرمیوں کا جواب ہے۔ تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ چاروں جمہوری ممالک کے درمیان بحر ہند کو سب کے لیے کھلا رکھنے کے لیے تعاون کرنے کی حکمت عملی پر اتفاق پایا جاتا ہے۔ 'کواڈ' میں چین کی حکمت عملی میں مثبت تبدیلی کروانے کی پوری صلاحیت ہے، لیکن بہت محتاط انداز میں اقدامات کرنا ہوں گے۔

یہ رپورٹ سی ایس آئی ایس کے ماہرین نے بحر ہند کی جیو پولیٹیکل صورتحال کے حوالے سے تیار کی ہے۔ ماہرین کے مطابق میری ٹائم سلک روڈ منصوبہ نہ تو مکمل طور پر معاشی منصوبہ ہے اور نہ مکمل طور پر عسکری منصوبہ ہے۔ چین کی حکمت عملی ابھی تیاری کے مراحل میں ہے، اس رپورٹ سے امریکا و دیگر ممالک کو میری ٹائم سلک روڈ کے حوالے سے اپنی حکمت عملی تیار کرنے میں مدد ملے گی۔ اس کے ساتھ ہی بیجنگ کو بھی اپنی معاشی حکمت عملی کو مزید واضح کرنے پر زور ڈالا جاسکے گا۔

(ترجمہ: سید طالوت اختر)

(رائٹر مائیکل جے گرین سی ایس آئی ایس میں جاپان اور ایشیا چیئر کے سینئر نائب صدر ہیں)

"China's maritime silk road: Strategic and economic implications for the Indo-Pacific region". ("csis.org". April 2, 2018)

''معارف فیچر'' حاصل کرنے کے خواہشمند خواتین و حضرات اور اداروں سے گزارش ہے کہ اپنے نام اور پتے کے ساتھ (رضاکارانہ طور پر) =/۵۰۰ روپے کا ڈاک ٹکٹ یا کراچی کے کسی بینک کا اتنی مالیت کا چیک ''اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی'' کے نام ارسال کریں۔ آپ کا بینک بیرونِ کراچی ہو تو پھر بینک ڈرافٹ یا منی آرڈر بھیجیں۔ زرِ خریداری موصول ہوجانے کے بعد آپ کے دیے ہوئے پتے پر ''معارف فیچر'' کی ترسیل شروع ہوجائے گی۔ ان شاء اللہ!

کون ہوگا محمود عباس کا جانشین؟

Adnan Abu Amer

۱۵اور۲۱مئی کے دوران فلسطینی اتھارٹی کے صدر محمود عباس کو تین بار رام اللہ کے مرکزی اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ان کے کان کا آپریشن ہوا ہے۔مختلف ٹیسٹ کے نتائج کی روشنی میں ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ان کی حالت خطرے سے باہر ہے تاہم ان کی صحت کے حوالے سے چہ مگوئیاں جاری ہیں، قیاس آرائیوں کا بازار گرم ہے۔ ۲۰ مئی کو محمود عباس تیسری مرتبہ اسپتال میں داخل کیے گئے۔ یہ پھیپھڑوں کے انفیکشن کا معاملہ تھا۔انہیں نس کے ذریعے اینٹی بایوٹکس دی گئیں۔

۸۲ سالہ محمود عباس کو اس سال اسپتال میں داخل کرنے کا یہ کوئی پہلا واقعہ نہیں۔فروری میں انہیں میری لینڈ (امریکا) کے جان ہاپکنز اسپتال میں داخل کیا گیا تھا اور یہ بات اب تک واضح نہیں ہوسکی کہ وہ کس مرض میں مبتلا تھے یا محض معمول کے طبی معائنے کے لیے گئے تھے۔ یہ وقت محمود عباس کے جانشین کے انتخاب کا ہے۔ان کی صحت کے حوالے سے کسی بھی وقت کوئی چونکانے والی خبر آسکتی ہے۔ ایسے میں ضروری ہے کہ پس پردہ تیاریاں شروع کردی جائیں۔

محمود عباس سے وابستہ ایک فلسطینی افسر نے بتایا کہ کسی بھی عام آدمی کی طرح محمود عباس بھی بیمار پڑتے اور صحت یاب ہوتے ہیں۔ان کی عمر بھی خاصی ہے اور کام کا بوجھ بھی بہت ہے، جس کے باعث وہ تھک جاتے ہیں۔مگر خیر، اس حوالے سے زیادہ قیاس آرائیوں کی گنجائش نہیں۔ ان کے معاونین اب بھی انہیں فائلز بھیجتے ہیں اور وہ اسپتال میں اپنے بستر پر ہی بہت سے دفتری امور نمٹاتے ہیں۔ڈاکٹروں نے انہیں زیادہ چلنے پھرنے سے منع کیا ہے اور آرام کا بھی مشورہ دیا ہے۔محمود عباس اگرچہ آرام کررہے ہیں مگر تھوڑا بہت کام بھی وہ کر ہی رہے ہیں۔ ویسے فلسطین کے آئینی اداروں (فلسطین نیشنل کونسل، فلسطین لیجسلیٹیو کونسل، فلسطین نیشنل کمیٹی یا ایگزیکٹیو کمیٹی آف فلسطین لبریشن آرگنائزیشن وغیرہ) کو اختیار ہے کہ کسی بھی ہنگامی صورتِ حال کے ابھرنے سے پہلے ہی مشاورت کا عمل کرکے کوئی متبادل انتظام تیار کرے۔ تشویش ناک بات یہ ہے کہ محمود عباس اسپتال میں داخل کیے گئے اور ۷ مئی کو استنبول (ترکی) میں اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے سربراہ اجلاس میں شریک نہ ہوسکے۔ان کی عدم شرکت نے فلسطینی علاقوں کے علاوہ دنیا بھر میں قیاس آرائیوں کو جنم دیا ہے۔مصر، قطر اور ترکی کے سربراہانِ مملکت وحکومت کے علاوہ عرب لیگ کے راہنماؤں نے بھی فون کرکے اُن کی خیریت دریافت کی۔محمود عباس کے حامی اور مخالف فلسطینی راہنماؤں میں سے کسی نے ان سے رابطہ نہیں کیا۔ ان کے ایک قریبی ساتھی اور تنظیم آزادیٔ فلسطین (پی ایل او) کی ایگزیکٹیو کمیٹی کے سیکریٹری جنرل صائب ارکات کہتے ہیں کہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ محمود عباس کی صحت کے حوالے سے افواہیں بے بنیاد ہیں۔ان کی صحت اچھی ہے اور وہ کام کرتے رہنے کی پوزیشن میں ہیں۔

عرب میڈیا، بین الاقوامی میڈیا، حتیٰ کہ اسرائیلی میڈیا نے بھی محمود عباس کی صحت کے بارے میں طرح طرح کی قیاس آرائیاں شائع کی ہیں۔ فلسطینی میڈیا البتہ مجموعی طور پر محتاط رہا ہے۔وہ نہیں چاہتا کہ محمود عباس کے بارے میں کچھ زیادہ کہیں اور قیاس آرائیوں کو ہوا ملے۔ فلسطینی میڈیا کی کوشش یہ ہے کہ محمود عباس کا جانشین تلاش کرنے کا معاملہ بھی اس طور طشت از بام نہیں ہونا چاہیے کہ لوگ حقیقت تک پہنچ سکیں۔

غیر سرکاری تنظیموں سے امور کے سابق فلسطینی وزیر حسن اصفر کہتے ہیں کہ محمود عباس کی صحت خراب ہے، ان کی عمر بھی زیادہ ہے اس لیے حقیقت پسندی کا مظاہرہ کیا جانا چاہیے۔ اس سے فلسطینی اتھارٹی کے اندرونی بحران کا بھی پتا چلتا ہے۔ محمود عباس کی صحت کے بارے میں کچھ نہ کہے جانے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ معاملات کی خرابی کہاں تک ہے۔ عام فلسطینیوں کو محمود عباس کی صحت کے حوالے سے تاریکی میں رکھا جارہا ہے۔ ہوسکتا ہے اس کا ایک بنیادی سبب یہ بھی ہو کہ خود محمود عباس کے اپنے قریبی ساتھی کسی بھی ہنگامی کیفیت کا سامنا کرنا کے لیے تیار نہ ہوں۔

حسن اصفر نے المانیٹر کو مزید بتایا کہ محمود عباس کے ساتھی اب تک حقیقت کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں۔ انہوں نے محمود عباس کے بعد کی صورت حال کے حوالے سے کچھ بھی کہنے، مشاورت کرنے سے گریز کیا ہے۔اس کے نتیجے میں خاصی گنجلک صورت حال پیدا ہوسکتی ہے۔اگر محمود عباس کا جانشین منتخب کرنے کے معاملے میں مشاورت کے ذریعے کسی نتیجے پر پہنچنا ممکن نہ ہوا تو غیر معمولی سیاسی بحران بھی جنم لے سکتا ہے۔

محمود عباس کے بعد کی مدت کے لیے کئی منظر نامے زیر غور ہیں۔فلسطین کا بنیادی قانون اسپیکر کو یہ اختیار دیتا ہے کہ وہ فلسطینی اتھارٹی کے سربراہ کی عدم موجودگی میں ساٹھ دن (یعنی انتخاب تک) اس منصب پر خدمات انجام دیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ محمود عباس کے فریم سے نکلنے سے قبل ہی ان کا نائب مقرر کردیا جائے۔تیسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ فلسطینی وزیر اعظم رامی حمد اللہ یا پھر الفتح کے نائب سربراہ محمود اللول فلسطینی اتھارٹی کی سربراہی سنبھالیں۔محمود عباس نے اب تک اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ تمام معاملات پر ان کی گرفت مضبوط دکھائی دیتی ہے۔انہوں نے اپنا نائب مقرر کرنے سے گریز کیا ہے۔انہیں شاید یہ خوف لاحق ہے کہ ان کا نائب اُن کا تختہ الٹ دے گا۔

حماس نے اس صورت حال پر اب تک خاموشی برقرار رکھی ہے۔محمود عباس نے غزہ کے معاملات پر اپنی گرفت مضبوط رکھی ہے اور اپریل ۲۰۱۷ء سے جو پابندیاں انہوں نے غزہ کی پٹی پر نافذ کی ہیں ان کے بعد سے حماس کو ایک طرف ہٹانے کا عمل جاری رہا ہے۔حماس کے ترجمان نے محمود عباس کی صحت کے حوالے سے المانیٹر سے بات کرنے سے معذرت کرلی۔

حماس کے پاس آئینی طور پر ایک ونگ کارڈ ہے۔محمود عباس کے نہ ہونے کی صورت میں فلسطینی قانون ساز کونسل کے اسپیکر کو ساٹھ دن کے لیے یہ منصب مل سکتا ہے۔ اس وقت اسپیکر کے منصب پر عزیز دویک فائز ہیں جن کا تعلق حماس سے ہے۔ وہ غرب اردن سے تعلق رکھتے ہیں۔حماس کے لیے یہ بات بہت حد تک مطمئن ہو رہنے کی ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والی شخصیت اسپیکر کے منصب پر فائز ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عزیز دویک سیاسی منظر نامے سے غائب رہتے ہیں اور انہیں فلسطینی اتھارٹی سے کسی سیاسی تنازع میں الجھنا بھی زیادہ پسند نہیں۔ انہیں اسرائیلی فورسز کے ہاتھوں گرفتار کیے جانے کا خدشہ بھی لاحق رہتا ہے۔اگر عزیز دویک نے آگے نہ بڑھنے اور فلسطینی اتھارٹی میں رونما ہونے والی قیادت کی تبدیلی میں اہم کردار ادا نہ کرنے کا فیصلہ کیا تو حماس ایک اہم ونگ کارڈ سے محروم ہوسکتی ہے۔

دی فلسطین سینٹر فار پالیسی ریسرچ اینڈ اسٹریٹجک اسٹڈیز ہانی المصری نے المانیٹر سے گفتگو میں کہا کہ رام اللہ میں اپریل کے آخر میں فلسطینی قومی کونسل کے اجلاس کے

دوران محمود عباس کے جانشین کے حوالے سے مشاورت ہوچکی ہے اور کسی بڑی تبدیلی کے لیے تیاریاں شروع کی جا چکی ہیں۔ فلسطینی قومی کونسل کا یہ سیشن محمود عباس کا جانشین منتخب کرنے اور اقتدار کو بہتر انداز سے منتقل کرنے کا میکینزم تیار کرسکتا تھا مگر محمود عباس نے ایسا کوئی بھی میکینزم تیار کرنے میں معاونت سے انکار کردیا۔

حسن المصری کے مطابق سنگین بات یہ ہے کہ اب تک فلسطینی اتھارٹی میں کوئی رہنما ایسے ممکنہ امیدوار کے طور پر سامنے نہیں آیا جسے مجموعی طور پر سب کی حمایت حاصل ہو یا جس پر سب متفق ہوں۔ اور شاید محمود عباس بھی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی امیدوار یعنی نائب کی حمایت نہ کرکے وہ اپنے آپ کو زیادہ طاقتور ثابت کررہے ہیں۔ کئی امیدوار ہیں جو محمود عباس کو رجھانے کی کوشش کررہے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ اگر محمود عباس نے اپنا جانشین واضح نہ کیا اور اس کی حمایت نہ کی تو ان کے بعد سنگین سیاسی بحران پیدا ہوسکتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ بحران عارضی نوعیت کا ہو اور اقتدار کی تقسیم کا عمل جلد مکمل ہوجائے تاہم خرابی پیدا تو ہوکر رہے گی۔

محمود عباس کے پاس تین بڑے منصب ہیں۔ وہ فلسطینی اتھارٹی کے علاوہ تنظیم آزادیٔ فلسطین اور فتح کے بھی سربراہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمود عباس کے بعد یہ تینوں عہدے الگ الگ شخصیات کو جاسکتے ہیں۔ اگر حماس نے غرب اردن میں زیادہ دلچسپی نہ لی تو یہ تینوں عہدے فتح گروپ کو جائیں گے۔ ممکنہ امیدواروں میں صائب ارکات، محمود اللول، ماجد فراج اور جبری رجوب شامل ہیں۔ صدارتی انتخاب کے دوران حماس کے لاتعلق رہنے کا البتہ امکان نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنا امیدوار کھڑا کرے یا پھر کسی امیدوار کی کھل کر حمایت کرے۔ (ترجمہ: محمد ابراہیم خان)

"Who will replace Abbas?"
("Al-Monitor". May 24, 2018)

حج وعمرہ کی سعادت حاصل کرنے والوں کے لیے راہنما کتاب

ندائے ابراہیمؑ

تالیف وترتیب: حبیب الرحمٰن (جدہ)

قیمت: ۱۵۰ روپے

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5
فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

فلسطین ایک پٹی ہوئی فلم ہے؟

وسعت اللہ خان

’ان پھسلواں ڈھلوانوں پر
گزرتے وقت کو دیکھتے دیکھتے
شکستہ سایوں کی پرچھائیں میں
ہم وہی کرتے ہیں جو ایک قیدی کرتا ہے
ہم امید بوتے رہتے ہیں‘ (محمود درویش)

پچھلے ۷۰ برس میں جتنی نظمیں فلسطینیوں نے لکھیں یا فلسطینیوں پر لکھی گئیں اور کس نے کس پے لکھیں؟ اقوامِ متحدہ میں جتنی قراردادیں فلسطین پر منظور ہوئیں اور کس معاملے پر منظور ہوئیں؟

کیا کسی اور قوم کی چوتھی نسل بھی کیمپوں میں پیدا ہوچکی ہے؟ کیا دنیا میں غزہ سے بڑی کوئی جیل ہے؟ ایسی جیل جس میں بیس لاکھ قیدی ہوں؟

پچھلے ۷۰ برس میں جتنے دلاسے فلسطینیوں کی جھولی میں ڈالے گئے، جتنی بار ان کے سامنے ان کے نام نہاد دوستوں کی پلکیں جھکیں، جتنے مشورے انہیں ملے، جتنی بار تحمل کی نصیحت ہوئی، جتنے مرئی و غیر مرئی احسانات ان پر جتائے گئے، جتنی بار انہیں جبری سمجھوتوں کے تھپڑ رسید ہوئے، کیا کسی اور انسانی گروہ کے ساتھ بھی یہ مسلسل مذاق ہوا؟

ہم ۷۰ برس سے فلسطینیوں کے حقوق کے حق میں نعرے لگاتے لگاتے تھک چکے ہیں۔ آخر ایک ہی فلم کوئی بار بار کتنی بار دیکھ سکتا ہے۔ بھلے اس میں کتنا بھی ایکشن، تھرل، رومانس، ٹریجڈی اور مزاح بھرا ہوا ہو۔

مگر ہاتھ کا پتھر گواہ ہے کہ ہر ہوش سنبھالنے والے فلسطینی بچے کے لیے یہ فلم ابھی ابھی شروع ہوئی ہے۔

اگر اسرائیل ایک زمینی حقیقت ہے، جو کوئی نہیں بدل سکتا تو پھر فلسطینی کیا ہیں؟ چلو کچھ اور زمینی حقائق مان لیتے ہیں تاکہ پاپ کٹے۔ غربت بھی زمینی حقیقت ہے، زیادہ غلہ کیوں اگائیں، نئی ملازمتیں کیوں پیدا کریں؟

بیماریاں بھی زمینی حقیقت ہیں، ان پر تحقیق اور ویکسین ایجاد کرنے پر اربوں ڈالر کھپانے کے بجائے انہیں خدا کا قہر کیوں نہ سمجھ لیں؟

دہشت گردی بھی زمینی حقیقت ہے اسے جڑ سے اکھاڑنے کے لیے دنیا کو عراق، شام، یمن اور افغانستان کیوں بنائیں؟

کیا ۱۴ مئی ۱۹۴۸ء سے پہلے اسرائیل زمینی حقیقت تھا؟ کیا فلسطینی حقیقت کو زمین سے کھرچ کر ایک نئی زمینی حقیقت وجود میں نہیں لائی گئی؟ اسی کلیے کے تحت برباد فلسطینی اگر ایک زمینی حقیقت ہیں تو انہیں ایک آباد زمینی حقیقت میں بھی تو بدلا جاسکتا ہے۔

امریکا کا اسرائیل کو زمینی حقیقت سمجھ کر ساتھ دینا تو سمجھ میں آتا ہے کیونکہ امریکا خود ریڈ انڈینز کی زمینی حقیقت کو افسانہ بنا کے وجود میں آیا مگر باقی یورپی اور غیر یورپی ممالک اور ان کے اصل باشندے تو صدیوں سے اپنی ہی زمینی حقیقت میں جی رہے ہیں۔

کوئی تو بتائے کہ فلسطینی اس زمین پر مریخ سے آکے آباد ہوئے، یا یہ امریکن انڈینز کا کوئی قبیلہ ہے جو ۱۵ ویں صدی میں امریکا چھوڑ کر فلسطین میں پناہ گزین ہوگیا، یا یہ ان غلاموں کے مفرور بچے ہیں جنہیں پانچ سو برس پہلے پکڑ پکڑ کر مغربی افریقا سے شمالی و جنوبی امریکا بھیجا جارہا تھا، یا یہ فلسطینی دراصل وہ ہسپانوی مسلمان ہیں، جنہیں تشریف پرلات مار کر آٹھ سو برس پہلے نکال دیا گیا اور انہوں نے یروشلم کے اردگرد ٹھکانے بنالیے۔

۱۹۴۸ء سے پہلے ان فلسطینیوں کی بھی کوئی شہریت، ملکیت ہوگی یا نئے زمینی حقائق نے اسے بھی دفن کردیا؟ ہاں دفن کردیا؟

اگر دلائل سے مسئلہ حل ہوسکتا تو آج فلسطینی دنیا کا سب سے زیادہ پرمسرت گروہ ہوتا۔ اصل زمینی حقیقت شاید طاقت ہے۔ طاقت ہے تو رات بھی دن ہے، طاقت ہے تو ظالم بھی مظلوم کا کاسٹیوم پہن کر تماشائیوں کو سسپنڈ ڈبلیف میں رکھ سکتا ہے، طاقت ہے تو غلامی بھی آزادی باور کروائی جاسکتی ہے۔

’محاصرہ تب تک جاری رہے گا
جب تک ہم
مکمل آزادی کے ساتھ مکمل غلامی نہیں چُن لیتے‘ (محمود درویش)

(بحوالہ: ”بی بی سی اردو ڈاٹ کام“۔ ۲۰ مئی ۲۰۱۸ء)

غزہ: میں نے مارچ میں شرکت کیوں کی؟

Haidar Eid

میں آزادیٔ فلسطین کے اس عظیم مارچ میں جب سے اس کا آغاز ہوا ہے ہفتے میں دو تین مرتبہ شرکت کرتا ہوں۔ اس مارچ میں شریک ہو کر مجھے اپنا گاؤں زرنوقہ بڑی شدت سے یاد آتا ہے، میرے اس گاؤں کو ۱۹۴۸ میں اسرائیلی غاصب افواج نے نیست و نابود کر کے ہزاروں فلسطینیوں کو بیدخل کر دیا تھا، اس میں میرے والدین بھی شامل تھے۔ اس عظیم مارچ کا مقصد ۱۹۴۸ سے شروع ہونے والے ظلم و ناانصافی کے خلاف آواز بلند کرنا ہے۔ ہماری اس جدوجہد کے بنیادی طور پر تین مقاصد ہیں:

ہمارا مطالبہ ہے کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق تمام فلسطینیوں کی ان کے آبائی علاقوں میں واپسی یقینی بنائی جائے۔

غزہ پر انسانیت سوز مظالم، نسل کشی اور بدترین محاصرے، ناکہ بندی کو فی الفور ختم کیا جائے۔

ہمیں امریکی سفارتخانے کی مقبوضہ یروشلم منتقلی کا متعصّبانہ فیصلہ ہرگز قبول نہیں۔

اس مارچ کے شرکاء کا تعلق فلسطین کی مختلف سیاسی، سماجی جماعتوں اور سول سوسائٹی سے ہے، یہ پروپیگنڈہ یکسر غلط ہے کہ یہ مارچ حماس کی تحریک پر ہو رہا ہے۔ اس تحریک میں فلسطین کی تمام نمایاں سیاسی جماعتوں کی نمائندگی بشمول فتح، پاپولر فرنٹ، فلسطین لبریشن، ڈیموکریٹک فرنٹ موجود ہے۔

۱۴ مئی کو میں ان ہزاروں مظاہرین میں شامل تھا جنھوں نے غزہ کے مشرقی حصے کی جانب مارچ کا فیصلہ کیا۔ ''آج فلسطین کی تاریخ کا نہایت اہم دن ہے۔ وہ دن جس کا ہر فلسطینی منتظر تھا''۔ یہ وہ تحریر ہے جسے گھر سے نکلنے سے پہلے میں نے اپنی فیس بک وال پر لکھا۔ میرے ہمراہ میرے تین دوست بھی تھے، جن میں ایک استاد، ایک سیلز مین اور ایک متحرک سیاسی کارکن شامل ہے۔ ہر شعبہ زندگی سے وابستہ ہزاروں مرد و عورت اور بچے اپنی فیملی کے ساتھ اس مارچ میں شریک ہیں۔ ہم سب شرکا غیر مسلح، اپنے مطالبات کے حق میں غزہ کے مشرقی باڑ کی جانب پرامن مارچ کر رہے تھے۔ اسی اثنا میں خوفزدہ اسرائیلی حکومت نے اپنے فوجیوں کو فائرنگ کا حکم دے دیا۔ صبح نو بجے جب فائرنگ شروع ہوئی تو مجھے ہر طرف زخمی مرد، عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کی اعضا سے محروم لاشیں بکھری نظر آئیں۔ یہ سارے مظاہرین پرامن تھے اور باڑ کو عبور کرنے کی کوشش بھی نہیں کر رہے تھے۔ ان شہدا میں ایک زخمی نوجوان کا چہرہ میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ جسے پیٹ میں گولی لگی اور وہ اسپتال لے جانے سے پہلے ہی اپنے رب سے جا ملا۔ ایک اور نوجوان جس نے فلسطینی پرچم سے اپنے منہ کو چھپایا ہوا تھا، اسے گردن میں گولی لگی لیکن وہ خوش قسمتی سے بچ گیا۔ شام ڈھلتے ۶۰ افراد شہید ہو چکے تھے، جبکہ زخمیوں کی تعداد تین ہزار سے زائد تھی۔

سب سے دلخراش منظر ۸ ماہ کی معصوم لیلیٰ اور معذور نادی ابوصالح کے مبارک جسد خاکی کا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں مجھے عزیز دوست احمد العدنی کی شہادت کی خبر ملی، احمد اپنے پیچھے تین سالہ بیٹی چھوڑ گیا۔

ہم جب اس نوجوان اور دیگر شہدا کی تدفین کر رہے تھے، ہمیں یہ محسوس ہو رہا تھا ہم اسرائیلی جبر اور مظالم کے سامنے تنہا ہیں، وہ لوگ بھی ہمارے ساتھ نہیں، جنہیں ہمارے ساتھ ہونا چاہیے تھا۔

گزشتہ چھ ہفتوں سے ہم دنیا کی مضبوط ترین افواج میں سے ایک یعنی اسرائیلی فوج کا نہتے مقابلہ کر رہے ہیں۔ جس کے پاس ڈیڑھ لاکھ سے زائد سپاہی، سیکڑوں وار ہیڈز، جدید ترین ٹینک، ایف سولہ طیارے، اپاچی ہیلی کاپٹر، ڈرون اور دیگر خودکار اسلحے موجود ہیں۔

اسرائیل کی ہر ممکن کوشش ہے کہ ہم اس کی غلامی اور محاصرے میں محصور ذلت آمیز زندگی گوارا کر لیں۔ ہمیں دن میں صرف چار گھنٹے بجلی ملتی ہے۔ ہمارا ۹۵ فیصد پانی پینے کے قابل نہیں۔ شدید زخمیوں کو علاج کے لیے مغربی کنارے لے جانے کے لیے مہینوں انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اسپتالوں کی حالت انتہائی مخدوش ہیں۔ ان اسپتالوں میں ۳۰ مارچ سے لائے جانے والے ۲۰۰۰ زخمیوں کو بمشکل طبی امداد فراہم کی جا رہی ہے۔

عرب حکومتیں اور یورپی یونین نے سوائے بیانات کے ہمارے لیے کچھ نہیں کیا۔ ان تمام ریاستوں کا رویہ ہمارے حوالے سے شرمناک، منافقت اور بزدلی پر مبنی ہے۔ ہم سے غلامانہ طرز عمل کی توقع کی جا رہی ہے کہ ہم ان کے غلام اور ماتحت زندگی بسر کریں، ان کے بچے ہوئے دسترخوان پر شکم سیری کر لیں، اپنی موت کو تسلیم کر لیں اور مزاحمت کا راستہ ترک کر دیں۔ ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ ہمیں ہماری ہی غلطیوں کی وجہ سے گولی ماری جا رہی ہے۔

ہم جب اپنے ہاتھوں سے اپنے پیاروں کو قبر میں اتار رہے ہیں، ہمیں معلوم ہے کہ عرب لیگ، یورپی یونین اور اقوام متحدہ ہمارے لیے کچھ نہیں کرے گی۔ ہمارے پاس ایک ہی قابل عمل راستہ ہے اور وہ عوامی طاقت کے ذریعے منظّم

باقی صفحہ نمبر ۱۳

بقیہ: امریکا کو غصہ کیوں آتا ہے؟

ہمیں ایسی تصویریں بھی آسانی سے مل سکتی ہیں جن میں امریکی فوجی جنگ میں مارے جانے والے فلپائنی باشندوں کی ہڈیوں کے ڈھیر پر کھڑے بہت فخر سے اپنی فتح کا اعلان اور مسرّت کا اظہار کر رہے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ انسانی ہڈیوں کے ڈھیر پر مسرت کا اظہار محض فلپائن تک محدود نہیں رہا۔ امریکیوں نے ہر دور میں ایسے ہی تماشے دکھائے ہیں۔ امریکی افواج نے اپنے خطے میں اور اُس سے باہر جہاں بھی طاقت کا بھرپور مظاہرہ کیا ہے، اُس کی کوشش رہی ہے کہ اہلِ جہاں کو اُس کی بھرپور طاقت کا بخوبی اندازہ ہو جائے۔ اِس مقصد کے حُصول کے لیے کمزور اور نہتّے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جبر کا نشانہ بنانا اُس کا مطمحِ نظر رہا ہے۔

امریکی فوج کی طرف سے طاقت کا بے دریغ اور بے لگام استعمال بالآخر کئی ممالک کی آزادی سلب کرنے کا سبب بنا۔ جو ملک آزادی، حقوق اور جمہوریت کے عظیم ترین آئیڈیلز کو حقیقی شکل دینے کے لیے دُنیا کے نقشے پر نمودار ہوا تھا اور جس کے بنیادی مقاصد میں اِنسان کی رفعت سرِفہرست تھی اُسی نے دُنیا کا نظام تہس نہس کرنے اور معاشروں کو تلپٹ کرنے والی استعماری قوت کی شکل اختیار کر لی۔ امریکی قائدین طاقت کے اظہار کا جو کھیل جاری رکھنا چاہتے تھے اُس کا دائرہ کچھ اپنے خطے تک محدود نہ تھا۔ کیوبا تو پڑوس ہی میں تھا۔ اُسے دبوچنے کے بعد فلپائن کو مُٹّھی میں کیا گیا۔ پھر تو یہ معاملہ طول پکڑتا چلا گیا۔ ۱۸۹۸ء میں فلپائن، پورٹوریکو اور گوام امریکی نوآبادی میں تبدیل ہوئے۔ دوسری طرف کیوبا کو رسمی طور پر آزادی دی تو گئی مگر اِس سلسلے میں چند شرائط عائد کی گئیں۔ سب سے اہم شرط یہ تھی امریکی فوج پلیٹ امینڈمنٹ کے تحت کیوبا کی سرزمین پر اپنا اڈّا ہمیشہ رکھے گی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ امریکا کیوبا میں اپنی فوج رکھے گا اور اُس کی دفاعی اور خارجہ پالیسی امریکا ہی تشکیل دے گا۔

| | |

ایران مسائل کی جڑ، یا اُن کا حل!!

ولی نصر

پچھلے دس سال سے جاری خانہ جنگی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی تغیرات نے خطے میں جنگ عظیم اول سے قائم سیاسی نظام کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ جیسے جیسے آمرانہ نظام اپنے انجام کو پہنچے تو ان کے ساتھ ہی قومی ادارے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئے اور ان ممالک کی عالمی سرحدیں بھی متاثر ہوئیں۔ شام اور یمن خونی خانہ جنگی کا شکار ہو چکے ہیں اور اس خانہ جنگی کو غیر ملکی فوجی مداخلتوں نے مزید سلگایا ہے۔ دوسری طرف امریکا اور اس کی اتحادی فوج کے آپریشن سے قبل ایک دہشت گرد تنظیم داعش، عراق اور شام کے ایک بڑے علاقے پر قبضہ کر چکی تھی۔

ٹرمپ انتظامیہ، واشنگٹن اور خطے کے دیگر ممالک کے سرکاری حکام اور دیگر ماہرین کی نظر میں اس بدترین صورتحال کا ذمہ دار ''ایران'' ہے۔ ان کا خیال ہے کے ایران نے دہشت گرد گروہوں کی مالی مدد کی ہے، بشار الاسد جیسے آمر کی حمایت کی ہے اور یمن میں حوثی باغیوں کی بھی مکمل معاونت کی ہے۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایران کو دنیا بھر میں ریاستی سطح پر ''دہشت گردوں کی معاونت کرنے والا مرکزی ملک'' قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے ایران کے ساتھ ۲۰۱۵ء میں ہونے والے ایٹمی معاہدے کو بھی ''اب تک کا بدترین معاہدہ'' قرار دے کر اسے مسترد کر دیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دیتے کے ایران معاہدے کی شرائط پر عمل کرے گا۔ امریکا کے سیکریٹری دفاع جیمس میٹس کا کہنا ہے کہ ''مشرق وسطیٰ کی امن وسلامتی کے لیے واحد خطرہ ایران ہے''۔ سعودی وزیر خارجہ عادل الاجبیر کا کہنا ہے کہ ''ایران تباہی کے راستے پر ہے''۔

واشنگٹن کا خیال ہے کہ ایرانی اثر ورسوخ کو کم کرنے سے مشرق وسطیٰ میں امن لوٹ آئے گا۔ لیکن یہ اندازے غلط بنیادوں پر لگائے جا رہے ہیں، جس کی وجہ سے یہ پہلے ہی مرحلے میں غلط ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایران اس تباہی کا ذمہ دار نہیں اور نہ ہی ایران کو گھیرے میں لینا خطے میں استحکام کا باعث بنے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کے ایران کے رویے کی وجہ سے امریکا کو سخت چیلنج کا سامنا ہے، اور نہ ہی اس حقیقت کو رد کیا جا سکتا ہے کہ عرب دنیا میں قائم سیاسی نظام کی تباہی سے ایران کو فائدہ ہوگا (کیوں کہ یہ نظام ایران کو آگے بڑھنے سے روکے ہوئے تھا)۔ لیکن اس سب کے باوجود ایران کی خارجہ پالیسی مغربی تجزیہ نگاروں کے برعکس حقیقت پسندی پر مبنی ہے۔ اپنے ایٹمی پروگرام پر امریکا سے مذاکرات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ایران ''اسلامی انقلاب'' کو دنیا بھر میں پھیلانے کے بجائے اپنے قومی مفادات کو مقدم رکھتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں استحکام صرف اسی صورت میں آ سکتا ہے جب امریکا یہاں کے تنازعات کے حل اور خطے میں توازن قائم کرنے کے لیے زیادہ فعال کردار ادا کرے۔ اس کام کے لیے ایک ''متوازن اپروچ'' کی ضرورت ہے، جس کے تحت ایران کے ساتھ جھگڑنے کے بجائے کام کرنے کی کوشش کی جائے۔

اکثر مغربی سیاستدان اور تجزیہ کار ایرانی مفادات اور اس کے ارادوں کو انقلاب کی حد تک محدود کر دیتے ہیں۔ اس وقت ایران نظریے کے بجائے ملک کے طور پر اپنی حیثیت منوانے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ دراصل تہران میں جس طرح قدامت پسند اور انقلابی موجود ہیں بالکل اسی طرح بہت سے اعتدال پسند اور حقیقت پسند سیاستدان بھی موجود ہیں، جو کے مغرب سے معاملات کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں۔ داخلی سیاست میں تو ان دو دھڑوں کے درمیان مخصوص رقابت پائی جاتی ہے۔ لیکن جب بات خارجہ پالیسی کی ہو تو قوم پرستی اور قومی سلامتی کے معاملات پر ان کے درمیان اتفاق رائے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایٹمی پروگرام کے حوالے سے ہونے والے معاہدے پر دستخط اسی اتفاق رائے کا نتیجہ تھا۔

کچھ تبصرہ نگار، مزاحمت کاروں اور ملیشیا کے بیرون ملک استعمال کرتے ہوئے ایران کو بالکل اسی طرح دیکھتے ہیں جیسا کہ امریکا چین اور سوویت یونین کو انقلاب کے دورِ عروج پر دیکھا کرتا تھا (امریکا سمجھتا تھا کہ یہ دونوں طاقتیں غیر معمولی وسائل کو بروئے کار لا کر قائم سیاسی نظام کو عدم استحکام کا شکار کر کے خطے میں افراتفری پھیلانا چاہتی ہیں)۔ جیمز میٹس نے ایک پروگرام میں خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ''ایران اپنے منفی اثر ورسوخ کو وسعت دینا چاہتا ہے''۔ درحقیقت ایران سوویت یونین دور کے روس اور چین کے انقلابی کردار کی تقلید کرنے کے بجائے جدید دور کے روس اور چین سے زیادہ قریب دکھائی دیتا ہے۔ وہ خطے میں اپنے کردار کو محدود کرنے کی منصوبہ بندی کی مخالفت کرتا ہے۔ ایران کا طریقہ کار اکثر عالمی روایات کے خلاف ہوتا ہے، لیکن قومی مفادات کے عین مطابق ہوتا ہے۔ ایران دنیا کو ''ماؤ'' اور ''لینن'' کی نظر سے دیکھنے کے بجائے ''ژی جن پنگ'' اور ''ولادی میر پوٹن'' کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یعنی کے اس کی پالیسیوں میں انقلابیت کے بجائے قوم پرستی کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

ایران کے موجودہ نقطہ نظر کے پیچھے صرف ۱۹۷۹ء کا انقلاب ہی نہیں ہے، بلکہ ''پہلوی خاندان'' کا بھی کردار ہے، جس نے انقلاب سے قبل تقریباً پچاس سال حکومت کی۔ محمد رضا پہلوی، جو کہ پہلوی خاندان کے آخری بادشاہ تھے، انھوں نے ان خواہشات کا اظہار کیا تھا کہ ایران مشرق وسطیٰ میں غالب طاقت ہو، اس کی فوجی برتری بھی ہو اور خلیج فارس پر مکمل کنٹرول اسی کا ہو۔ کچھ عرصہ تو اسلامی ریاست نے ان خیالات کو قومیت کا رنگ دینے کے بجائے اسے نظریاتی رنگ دے کر آگے بڑھایا۔ لیکن پچھلے پندرہ سالوں میں قومیت تیزی سے پروان چڑھی ہے۔ اب ایران کے راہنما مذہب کے ساتھ اپنے لگاؤ اور اپنے مذہبی نظریات کو قومیت کے ساتھ ملا جلا کر پیش کرتے ہیں۔ روس اور چین کی طرح ایران کے ساتھ بھی تابناک ماضی کی یادیں جڑیں ہیں اور وہ اپنی اس مرکزی حیثیت کو کبھی نہیں بھولتے جو انہیں اس سامراجی کے دور میں حاصل تھی اور وہ اسی حیثیت کو حاصل کرنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ اسی لیے چین اور روس کی طرح ایران کو بھی خطے میں امریکی سربراہی میں کسی قسم کا نظام اپنے ارادوں کے درمیان ایک دیوار کی طرح محسوس ہوتا ہے۔

لیکن اس طرح کی قوم پرستی سے جڑی خواہشات نے قومی سلامتی کے حوالے سے خدشات میں بھی اضافہ کر دیا ہے۔ اسرائیلی اور امریکی فوج ایران کے لیے ایک مستقل خطرہ بن چکی ہے۔ افغانستان اور عراق پر امریکی قبضے اور ہزاروں امریکی فوجیوں کی ایرانی سرحد پر موجودگی نے تہران کو اس بات کا احساس دلایا ہے کہ ''ایرانی فوج کے لیے امریکی فوج کی پیش قدمی کو میدان جنگ میں روکنے کا سوچنا بھی بے وقوفی کی علامت ثابت ہوگا''۔ لیکن عراق پر امریکی قبضے نے ایک اور بات بھی ثابت کی کہ ''ابتدائی قبضے کے بعد شیعہ اور سنی ملیشیا کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ امریکا کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر

دیں۔'' عراق جنگ کے دوران ایران نے امریکی فوجیوں کو مارنے کے لیے نجی ملیشیاؤں کو نہ صرف ہتھیار فراہم کیے بلکہ ان کی تربیت بھی کی۔ اور ایران کے اسی قسم کے اقدامات ٹرمپ انتظامیہ کی نفرت انگیزی کی بڑی وجہ ہیں۔

ایران کو عرب دنیا سے بھی خطرہ لاحق ہے۔ عرب دنیا ۱۹۵۸ء کے عراقی انقلاب کے بعد سے لے کر ۲۰۰۳ء تک ایران کے لیے ایک مستقل خطرہ رہی ہے۔ عرب دنیا کے حوالے سے موجودہ ایرانی پالیسیوں میں ۱۹۸۰ء میں لڑی جانے والی ایران عراق جنگ کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ایران کے بہت سے سینئر سیاستدان اس جنگ میں شریک رہ چکے ہیں، اس جنگ کے دوران عراق نے نہ صرف ایرانی زمین پر قبضہ کیا تھا، بلکہ ایرانیوں کے خلاف کیمیائی ہتھیار بھی استعمال کیے تھے اور ایران کے شہری علاقوں کو بھی میزائلوں سے نشانہ بنایا تھا۔ ۲۰۰۳ء کے بعد سے عراق اور شام میں کردوں کی ابھرتی ہوئی علیحدگی پسند تحریکیں اور خطے میں شیعہ سنی کشیدگی میں ہونے والے اضافے نے ایران کی اس سوچ کو مزید پختہ کیا ہے کہ عرب دنیا سے اسے شدید خطرات لاحق ہیں۔

ایران اس بات پر بھی پریشان ہے کہ اس کے روایتی حریفوں نے اسے اسلحہ کی دوڑ میں پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ عالمی تحقیقی ادارہ برائے امن، سٹاک ہوم کے ۲۰۱۶ء کے اعداد و شمار کے مطابق ایران نے اپنی مجموعی ملکی پیداوار کا ۳ فیصد اپنے دفاع پر خرچ کیا۔ اور یہ خطے کے باقی ممالک کے تناسب کے لحاظ سے کم ہے۔ سعودی عرب نے اپنی مجموعی ملکی پیداوار کا دس فیصد، اسرائیل چھ فیصد، عراق پانچ فیصد اور اردن چار فیصد خرچ کرتا ہے۔ مشرق وسطیٰ میں ایران مجموعی ملکی پیداوار کے لحاظ سے دفاعی اخراجات میں آٹھویں نمبر پر ہے۔ ایران کے دفاعی اخراجات، رقم کے لحاظ سے بھی ان ممالک سے کم ہے۔ مثال کے طور پر ۲۰۱۶ء میں سعودی عرب نے ۶۳ء۷ ارب ڈالر اپنے دفاعی اخراجات پر خرچ کیے، جو کہ ایرانی بجٹ (۱۲ء۷ ارب ڈالر) سے پانچ گنا زیادہ ہے۔

اس کمی کے ازالے کے لیے ایران نے ''آگے بڑھ کر دفاع'' کرنے کی حکمت عملی اپنائی ہے۔ اس حکمت عملی کے تحت وہ مشرق وسطیٰ میں مزاحمتی گروہوں اور نجی ملیشیاؤں کی معاونت کرتا ہے، جن میں حزب اللہ اور حماس شامل ہیں۔ اور یہ دونوں گروہ اسرائیلی سرحد کے لیے ایک مستقل خطرہ ہیں۔ ایران کا سب سے خطرناک فوجی یونٹ ''قدس فورس'' ہے، جو کہ پاسداران انقلاب کا حصہ ہے۔ اس یونٹ کو ''پراکسی جنگوں'' میں حصہ لینے کی مخصوص تربیت دی جاتی ہے۔ اور حزب اللہ نے عرب ممالک کی طرف سے اسرائیل کو واحد فوجی شکست دے کر اپنے آپ کو موثر اتحادی ثابت کیا ہے۔ حزب اللہ نے ۲۰۰۰ء میں اسرائیل کو جنوبی لبنان سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر مجبور کیا اور ۲۰۰۶ء میں اسرائیلی جارحیت کا بہترین دفاع کیا۔

کم و بیش اسی طرح کی دلیل ایران کے طویل فاصلے تک مار کرنے والے میزائل (اور ۲۰۱۵ء کے معاہدے سے پہلے ایٹمی پروگرام کی بھی) پروگرام کی بھی ہے۔ ایران نے اس طرح کے پروگرام اپنے دفاع اور اپنی ''پراکسیز'' کے دفاع کو مضبوط کرنے کے لیے شروع کیا تھا۔ ایران اپنے ایٹمی پروگرام کو منجمد کر چکا ہے، اب حکمت عملی یہ بنائی گئی ہے کہ میزائل پروگرام کو اتنی ترقی دی جائے گی کہ کوئی طاقتور ملک بھی اس پر یا اس کے اتحادی پر کوئی حملہ نہ کر سکے، اور حملے کی صورت میں اسے زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے۔

اگر ایران کا موجودہ رویہ پہلے سے زیادہ جارحیت پر مبنی یا خطرناک محسوس ہوتا ہے، تو اس کی وجہ ہرگز یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے حریفوں سے ٹکراؤ چاہتا ہے یا خطے کو عدم استحکام کا شکار کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس کا اس جارحانہ رویہ کی وجہ پچھلے پندرہ برسوں میں مشرق وسطیٰ میں آنے والی زبردست تبدیلی ہے۔ وہ دن گئے جب واشنگٹن خطے کے معاملات کو کنٹرول کرنے اور ایران کے کردار کو محدود کرنے کے لیے عرب حکومتوں کا سہارا لیا کرتا تھا۔ ۲۰۰۳ء کے عراق میں ہونے والے امریکی حملے کے بعد ہونے والے واقعات اس رخ پر چلے گئے کہ وہ عرب دنیا میں سماجی اور سیاسی عدم استحکام کا شکار ہوئے، جس کے نتیجے میں وہاں کے حکمرانوں کو گھر جانا پڑا، وہاں کے حکومتی ادارے تباہ ہو گئے، اور کچھ جگہوں پر فرقہ وارانہ اور لسانی فسادات خانہ جنگی کی صورت اختیار کر گئے۔

عرب دنیا میں آنے والے عدم استحکام نے وہاں کے طاقت کے مراکز کو کمزور کر دیا اور اس عمل سے ایران نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور خطے میں اپنے اثر و رسوخ میں بھی اضافہ کیا۔ ایران نے عراق میں ''کردوں'' اور ''شیعہ سیاسی قوتوں'' کو استعمال کر کے وہاں کے تنازعات حل کروائے، سیاسی اتحاد تشکیل دیے اور وہاں کی پالیسی سازی کے عمل میں مداخلت کی۔ جس کے نتیجے میں عراق، امریکا سمیت کسی بھی ملک کے مقابلے میں ایرانی اثر و رسوخ سے سب سے زیادہ متاثر ہوا۔ شام میں ایران نے حزب اللہ کے جنگجوؤں کے ساتھ پورے مشرق وسطیٰ سے نوجوانوں کو جمع کر کے ایک موثر فوج تشکیل دی، جس کو شامی حزب اختلاف کے خلاف جنگ کے لیے استعمال کیا گیا۔ اور جیسے جیسے بشار اس خانہ جنگی میں غالب آتا گیا ویسے ہی دمشق پر ایران کا اثر و رسوخ بڑھتا چلا گیا۔ اور یمن میں ایران نے بہت معمولی سے سرمایہ کاری کر کے سعودی عرب اور اس کے اتحادیوں کو ایک مہنگی جنگ کی دلدل میں پھنسا دیا، جس کے نتیجے میں سعودی وسائل شام اور عراق کے بجائے یمن میں استعمال ہونے لگے۔

لیکن اس عدم استحکام نے نئے خطرات بھی پیدا کیے ہیں۔ عرب ممالک کے عوام میں ایران کی شامی حکومت کی مدد کے خلاف شدید اشتعال پایا جاتا ہے۔ ۲۰۱۲ء میں شائع ہونے والے Zogby کے سروے کے مطابق جیسے ہی ایران نے شامی جنگ میں مداخلت کی تو عرب دنیا میں ایرانی حمایت ۷۵ فیصد (۲۰۰۶ء میں) سے کم ہو کر ۲۵ فیصد رہ گئی۔ لیکن داعش (جو کہ بنیادی طور پر اہل تشیع اور ایران کے خلاف وجود میں آئی) کے ڈرامائی عروج سے ایرانی اثر و رسوخ کے خلاف جاری سنی مزاحمت کو کافی ریلیف ملا۔ داعش جس طرح کے حالات سے دوچار ہوئی، اس نے تہران کی نظر میں ''آگے بڑھ کر دفاع'' کرنے کی پالیسی کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا۔ اگر ایرانی فوج کی عراق اور شام میں موجود اپنے اتحادیوں تک پہنچ نہ ہوتی، تو داعش بہت تیزی کے ساتھ دمشق، بغداد اور اربیل کو فتح کرتی ہوئی ایران کی سرحدوں تک پہنچ جاتی۔ اگرچہ ایران کے حریف ایران کی مزاحمتی و مسلح گروہوں کی حمایت کی پالیسی کو انقلاب اور شیعہ ازم کو پھیلانے کے مقاصد کی نظر سے دیکھتے ہیں، لیکن حقیقت میں ایران کی اس پالیسی کے در پردہ مقاصد خالصتاً پیشہ وارانہ ہیں۔ عرب میں جتنا زیادہ عدم استحکام ہوگا ایران کا وہاں کے معاملات میں مداخلت کا ارادہ اتنا ہی مضبوط ہوگا۔

خطے میں پیدا ہونے والے نئے حالات نے ایران اور امریکا اور اس کے اتحادی عربوں کے درمیان براہ راست تصادم کے خطرات کو بڑھا دیا ہے۔ لیکن یہاں بھی ایران کے رہنماؤں کو معلوم ہے کہ ان کو ان حالات کا فائدہ ہی ہوگا۔ داعش کے خلاف لڑی جانے والی جنگ نے ایران کی لڑنے کی صلاحیت کو مزید نکھارا ہے۔ پاسدارانِ انقلاب نے داعش کے خلاف لڑنے والے عراقی شیعوں کو تربیت دی، اس

کے علاوہ شام اور یمن میں لڑنے کے لیے مشرق وسطیٰ سے آئے ہوئے رضا کاروں کو بھی تربیت فراہم کی۔ حزب اللہ کے ساتھ مل کر یہ سارے گروہ ایک بڑی قوت میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ جب یہ جنگ ختم ہوگی تو یہ اپنے ممالک کے سیاسی نظام میں موثر گروہ کی حیثیت سے کام کریں گے، جس سے عرب دنیا پر ایران کے اثر ورسوخ میں نمایاں اضافہ ہوگا۔ اور اس طرح سعودی عرب کے لیے تنہا اس خطے کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جائے گا۔

گزشتہ ایک برس کے دوران سعودی عرب سے بڑھتی ہوئی کشیدگی، ٹرمپ انتظامیہ کی طرف سے سخت بیانات، اور مسلمان ممالک پر سفری پابندیاں، جن میں ایران بھی شامل ہے، ایرانی قوم میں قوم پرستی کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوئیں۔ اور امریکا کے ساتھ بگڑتے تعلقات کی ایک وجہ سعودی عرب اور امریکا کے مابین از سر نو بہتر ہوتے تعلقات بھی ہیں۔ ویسے تو ایٹمی معاہدہ ہونے کے بعد سے ہی ایران اور سعودی عرب کے تعلقات میں کشیدگی بڑھ گئی تھی، لیکن ٹرمپ کے صدارت سنبھالنے کے بعد اس میں اچانک اضافہ ہوا ہے۔ مئی ۲۰۱۷ء میں سعودی ولی عہد شہزادہ محمد بن سلمان نے ایک بیان میں دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ "مشرق وسطیٰ میں اثر ورسوخ کی جنگ دراصل ایران کی حدود میں لڑی جائے گی"۔

عرب ممالک اور مغربی دارالحکومتوں میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں سے اب ایران بھی محفوظ نہیں رہا۔ گزشتہ برس جون میں خودکش حملہ آوروں نے ایرانی پارلیمان کی عمارت پر حملہ کیا اور ایران کے پہلے سپریم لیڈر روح اللہ خمینی کے مزار پر بھی حملہ کیا گیا، ان کارروائیوں میں ۱۸ لوگ جاں بحق ہوئے۔ ایرانی سرزمین کے اردگرد منڈلانے والے خطرات نے ایرانی عوام کو "آگے بڑھ کر دفاع کرنے" کی پالیسی کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ شامی جنگ کے آغاز میں تو ایرانی رہنما وہاں اپنی مداخلت کو چھپانے کی بھرپور کوششیں کیا کرتے تھے، لیکن اب شام میں مرنے والوں کو "شہید" قرار دے کر عوام میں کافی پذیرائی دی جاتی ہے۔

دسمبر کے اختتام میں ہونے والے حکومت مخالف مظاہروں میں ایسے نعرے بھی لگائے گئے جن میں لبنان، شام اور فلسطین میں ایرانی مداخلت پر سوالات اٹھائے گئے تھے۔ مظاہرین کا کہنا تھا کہ "آگے بڑھ کر دفاع کرنے کی پالیسی کے تحت ان ملکی وسائل کو غیر ممالک میں جھونک دیا گیا، جن کی اپنے ملک میں اشد ضرورت تھی"۔ لیکن عوام کی تنقید کے باوجود حکومت اپنی سامراجی سوچ سے پیچھے ہٹتی دکھائی نہیں دیتی۔ ایرانی اپنی حکومت کے علاقائی عزائم پر ضرور تنقید کرتے ہیں، لیکن دفاعی ضروریات کے بارے میں ان کے ذہنوں میں کسی قسم کا کوئی ابہام نہیں ہے۔ وہ سنی انتہا پسندوں کی جانب سے عراق، شام اور خود ایران میں واقع اپنے مقدس شہروں پر حملوں کے خطرے کی وجہ سے پریشان ہیں۔ ایرانی رہنما خود پر ہونے والی تنقید سے نہیں گھبراتے۔ ان میں سے بہت سے رہنماؤں کا کہنا ہے کہ ان احتجاجی مظاہروں میں غیر ملکی ہاتھ ملوث ہے۔ وہ اس بات پر مکمل یقین رکھتے ہیں کہ ایران کو پیچھے ہٹنے کے بجائے مشرق وسطیٰ میں اپنے اتحادیوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔

اوباما انتظامیہ نے خطے کی خراب ہوتی صورتحال کا جواب خطے سے فاصلہ اختیار کر جانے کی صورت میں دیا۔ مداخلت کی امریکی حکمت عملی کے برعکس اوباما نے شام کی خانہ جنگی میں کردار ادا کرنے سے انکار کر دیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایران کے ساتھ ایٹمی مذاکرات بھی جاری رکھے۔ اس معاہدے نے عرب دنیا کو نہ صرف ناراض کر دیا بلکہ خطے میں کشیدگی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ لیکن اس سے وہ خطرات بھی کم ہو گئے جن کی وجہ سے امریکا مشرق وسطیٰ میں اپنا کردار ادا کرنے پر مجبور تھا۔ اس وجہ سے امریکا کو خطے میں عدم دلچسپی دکھانے میں مزید مدد ملی۔

ایٹمی معاہدے کی کامیابی نے امریکا ایران تعلقات میں گرم جوشی کے امکانات میں بھی اضافہ کیا۔ اور عرب اتحادیوں کو یہ خدشہ لاحق ہونے لگا کہ واشنگٹن اب ان کے مفادات کی حفاظت نہیں کرے گا اور شاید ان کی طرف سے منہ بھی موڑ لے۔

لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ امریکا نے خطے کے حوالے سے اپنی حکمت عملی زیادہ تبدیل نہیں کی۔ اوباما انتظامیہ نے عربوں کے غصے کو ٹھنڈا کرنے کے لیے بحرین، کویت، عمان، قطر، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب سے اسلحے کی فروخت کے بڑے بڑے معاہدے کیے۔ تہران میں ایٹمی معاہدے کی حمایت کرنے والوں کو اس عمل سے شدید مایوسی ہوئی۔ ایران نے تو ایٹم بم بنانے کی صلاحیتوں پر سمجھوتہ اس لیے کیا تھا کہ خطے میں روایتی ہتھیاروں کے معاملے میں اس کے حریفوں کو حاصل سبقت کم کی جا سکے۔ ۲۰۱۵ء میں سعودی عرب اور اس کے اتحادیوں نے ہتھیاروں کے معاملے میں حاصل سبقت کا یمن میں پہلی دفعہ عملی مظاہرہ کیا۔ اس حملے کے بارے میں ایران کو پہلے سے ہی اندازہ تھا۔ تہران نے اس اقدام کا جواب اپنے میزائل پروگرام کو دوگنا کر کے دیا۔

ٹرمپ انتظامیہ نے ایٹمی معاہدے پر یکسر مختلف راستہ اختیار کیا اور اس معاہدے سے پیچھے ہٹنا شروع کر دیا، اسی کے ساتھ ساتھ عربوں کے ساتھ اتحاد کے پرانے نظام کی طرف پلٹنا شروع کر دیا۔ جس میں سعودی عرب کو مرکزی حیثیت حاصل ہوگی۔ ایران کے ساتھ ایٹمی معاہدہ شاید چلتا رہے لیکن ان بنیادوں پر نہیں جن پر دونوں ممالک نے دستخط کیے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ اب ایران کا پہلے کی طرح گھیراؤ کرنا بھی ممکن نہیں رہا۔ عراق اور شام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں اور وہاں وہ لوگ حکمرانی کر رہے ہیں جو عربوں کے بجائے ایران سے قریب تر ہیں۔ "لیونت" کا بہت سا علاقہ ان دو ممالک کا حصہ ہے اور اس خطے نے ہمیشہ اپنے حریف فرقوں، قبائل اور قوموں کو مغلوب بنا کر رکھا ہے۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد سے "لیونت" کا علاقہ (یعنی عراق اور شام)، جس میں مصر اور سعودی عرب بھی شامل تھا، عرب دنیا کا اہم ستون تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد عراق نے خاص طور پر ایرانی اثر ورسوخ کے سامنے ڈھال کا کردار ادا کیا نہ صرف یہ بلکہ ایران کو "ٹف ٹائم" بھی دے کر رکھا۔

مشرق وسطیٰ کے حوالے سے امریکی حکمت عملی اس بات کا اشارہ دیتی ہے کہ امریکا دنیا کی حکمرانی سے دستبردار ہو رہا ہے۔ امریکا اس بات کی اہلیت نہیں رکھتا کہ وہ ایرانی پیش قدمی کو روک سکے اور نہ ہی ایسا کرنے کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو پر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ گزشتہ برس عراقی کردستان کی آزادی کے لیے ہونے والے ریفرنڈم میں امریکا کی ناقص حکمت عملی کا عملی مظاہرہ سامنے آیا۔ اگرچہ امریکا نے کردوں سے کہا تھا کہ وہ ووٹنگ نہ کروائیں، لیکن وہ انھیں روک نہ سکا اور آزادی کے لیے ہونے والی اس ووٹنگ کے بعد کے حالات کو کنٹرول کرنے میں بھی امریکا نے کوئی خاص کردار ادا نہیں کیا۔ بلکہ اس کے برعکس ایران نے اس تناؤ کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا، اگر یہ تنازعہ مزید شدت اختیار کر جاتا تو بغداد اور اربیل کے درمیان ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی۔ تہران نے کرد رہنماؤں پر زور ڈالا کہ وہ آزادی کے مطالبے سے پیچھے ہٹ جائیں، کرکوک کا قبضہ چھوڑ دیں اور خطے کی کرد حکومت میں ہونے والی تبدیلیوں کو بھی قبول کریں۔

امریکا کی طرح اس کا عرب اتحادی سعودی عرب بھی موقع سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکا۔لیکن سعودی عرب سنی عوام میں شام اور دیگر عرب ممالک میں ایرانی مداخلت کے خلاف شدید پروپیگنڈا کرنے میں کامیاب رہا۔ ۲۰۱۳ء سے ۲۰۱۶ء کے درمیان سعودی عرب نے قطر اور ترکی کے ساتھ مل کر شامی حزب اختلاف کے گروہوں کی معاونت کر کے ایران اور اس کے اتحادیوں کے لیے شام میں بہت مشکلات پیدا کر دیں تھیں۔لیکن پھر سعودی عرب نے اپنے ارادوں سے منہ پھیر لیا۔سعودی عرب نے قطر اور ترکی سے اختلافات شروع کر دیے، جس کے نتیجے میں بشار سنی حزب اختلاف پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا۔ادھر یمن میں حوثی باغی، سعودی سربراہی میں لڑنے والی اتحادی فوج کے سامنے ڈٹ گئے۔

ایران ابھی بھی سعودی عرب کے جارحانہ عزائم سے پریشان ہے۔شہزادہ سلمان نے یمن میں جنگ چھیڑ رکھی ہے، قطر کو تنہا کرنے کی کوششیں بھی جاری ہیں اور اس کے ساتھ نومبر میں لبنان کے طاقتور وزیر اعظم سعد حریری کو بھی استعفیٰ دینے پر مجبور کیا۔سابق بادشاہ کی پالیسی کے برعکس شہزادہ سلمان نے عراق میں کردار ادا کرنے کا عندیہ دیا ہے۔عراق میں وہ وہاں کے اہل تشیع سیاستدانوں سے رابطے کر رہے ہیں، ان سیاستدانوں میں معروف شیعہ رہنما مقتدا الصدر بھی شامل ہیں۔سعودی عرب اگر اس جارحانہ پالیسی کو جاری رکھتا ہے تو اسے مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ولی عہد کو اپنے والد سے بادشاہت لینے کا ایک مشکل کام بہت محتاط طریقے سے کرنا ہوگا۔اس کے علاوہ ایران کے ساتھ ٹکراؤ کی پالیسی کو جاری رکھتے ہوئے اپنے ملک میں سماجی اور معاشی اصلاحات کے پروگرام کو بھی آگے بڑھانا ہوگا۔لیکن ایران اتنا تنہا نہیں ہے جتنا کہ واشنگٹن اور اس کے اتحادی اسے دیکھنا چاہتے ہیں۔گزشتہ برس جون میں سعودی عرب کی سربراہی میں عرب ممالک کے اتحاد نے قطر کے ایران کے ساتھ تعلقات، سنی انتہا پسند تنظیموں کی حمایت اور اخوان المسلمون کی حمایت کے جرم میں اس کا سفارتی اور معاشی بائیکاٹ کرنے کی مہم چلائی۔لیکن قطر کو تنہا کرنے کوشش کا فائدہ یہ ہوا کہ وہ ایران کے زیادہ قریب ہو گیا۔اس کے علاوہ تہران کو خلیج فارس کے جنوبی ساحل تک رسائی بھی مل گئی۔

سعودی عرب کے اس اقدام سے اس کے ترکی کے ساتھ تعلقات بھی کشیدہ ہو گئے۔انقرہ کی حکمراں جماعت جسٹس اینڈ ڈویلپمنٹ پارٹی کے اخوان المسلمون سے مضبوط تعلقات ہیں، اس کے ساتھ سنی دنیا کی سربراہی کا اس کا اپنا ایک ''ویژن'' ہے۔اور خطے کے حوالے سے سعودی اور امریکی پالیسی ترکی کے مفادات کو نقصان پہنچاتی ہے۔ان سب حالات کی وجہ سے ترکی، روس اور ایران کی طرف پلٹنے پر مجبور ہوا۔ترکی کے صدر رجب طیب ایردوان نے ایران اور روس کے ساتھ اختلافات کے باوجود ایسی راہیں نکالیں کے ان ممالک کے ساتھ مل کر شام میں اہم کردار ادا کیا جا سکے۔اور اس مضبوط شراکت داری کا مظاہرہ گزشتہ برس نومبر میں اس وقت دیکھنے میں آیا جب سوچی میں ایردوان، روسی صدر ولادی میر پوٹن اور ایرانی صدر روحانی، شام کی قسمت کے فیصلے کرتے ہوئے ایک ساتھ دکھائی دیے۔ایران اور امریکا کے درمیان کشیدگی میں اضافے کا ایک تناظر شام میں روسی مداخلت کا بھی ہے۔۲۰۱۵ء میں روس نے شام کی خانہ جنگی میں بشار کی حمایت میں اترنے کا فیصلہ کیا۔امریکی حکام نے اس امکان کو مسترد کر دیا کہ روس شام میں مداخلت کر کے خطے میں اپنے اثر ورسوخ میں اضافہ کر سکے گا۔لیکن روس شام کے معاملے میں ایک اہم کردار کے طور پر سامنے آیا، نہ صرف شام بلکہ پورے مشرق وسطیٰ میں اگر کوئی مذاکرات یا معاملات کی بہتری کے لیے بات کرنا چاہتا ہے تو وہ روس ہی کی طرف دیکھتا ہے۔

روس یہ سب اہداف ایران کے بغیر حاصل نہیں کر سکتا تھا۔زمین پر ایران کی موجودگی نے روس کی فتح کو ممکن بنایا۔اور افغانستان، وسطی ایشیا، قفقاز میں ان دونوں ممالک نے مل کر امریکی اثر ورسوخ کا مقابلہ کیا۔دونوں ممالک اپنے آپ کو امریکا اور اس کے اتحادیوں کے سامنے ڈٹ جانے والی بڑی طاقتوں کے طور پر دیکھتے ہیں۔روس اپنے ''گریٹر'' مفادات کی تکمیل کے لیے ایران کی اہمیت سے باخبر ہے۔ایران جغرافیائی اعتبار سے ایک اہم مقام پر واقع، توانائی کے ذخائر سے مالا مال آٹھ کروڑ کی آبادی والا ملک ہے، جس کے اتحادیوں کا نیٹ ورک پورے مشرق وسطیٰ میں پھیلا ہوا ہے اور تقریباً سب اتحادی ہی امریکا کے دائرہ اثر ورسوخ سے باہر ہیں۔یہ سب خصوصیات پوٹن کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں، جو امریکا کو پیچھے دھکیلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

ایرانی اور روسی افواج وانٹیلی جنس نے شام کی خانہ جنگی میں مل کر کام کرنے کی وجہ سے آپس میں گہرے تعلقات قائم کر لیے ہیں، یہ تعلقات مستقبل میں امریکا کے ساتھ جنگ کی صورت میں ایران کی معاونت کریں گے۔گزشتہ برس امریکا جس طرح ایٹمی معاہدے سے پیچھے ہٹا ہے اور ایران پر دباؤ بڑھایا ہے اس سے تہران میں اس بات پر اتفاق ہو گیا ہے کہ اسے روس سے تعلقات مزید مضبوط کرنا ہوں گے۔اب ایران روس سے تجارت بڑھانے پر غور کرنے کے ساتھ ساتھ سعودی دفاعی اخراجات کا مقابلہ کرنے کے لیے روس سے جدید ہتھیاروں کی خریداری پر بھی غور کر رہا ہے۔اور شاید روس کے ساتھ ایک معاہدے پر بھی دستخط کرے، جس کے تحت فوج وخفیہ ایجنسیوں کے درمیان روابط بڑھائے جائیں گے۔اور روسی فوج وخفیہ ایجنسیوں کو ایرانی فوجی تنصیبات تک رسائی دی جائے گی، یاد رہے کہ ایران آج تک ایسے کسی اقدام سے گریز کرتا آیا ہے۔اور امریکا کی روسی بالا دستی ختم کرنے کی پالیسی اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک کے ایران کے اثر ورسوخ کا خاتمہ نہ کر دیا جائے۔

مشرق وسطیٰ میں عدم استحکام کی وجوہات کو سمجھنے کے بعد اگر ٹرمپ انظامیہ کی موجودہ ایران پالیسی کو دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ حکمت عملی نہ صرف امریکا کو الجھا رہی ہیں بلکہ اسے مشکلات کی طرف بھی دھکیل رہی ہے۔یہ سمجھ لینا کہ امریکا اور اس کے عرب اتحادی بہت آسانی سے ایران کا گھیراؤ کر لیں گے اور یہ قدم خطے میں استحکام کا باعث بنے گا، تو ایسی سوچ بہت ہی خطرناک قسم کی غلطی ثابت ہوگی۔فی الحال عراق اور شام میں اتنی امریکی فوج موجود نہیں کہ وہ حالات کو کنٹرول کر سکیں، حالات تو کنٹرول کرنا دور کی بات ایران کو بھی کنٹرول نہیں کر سکتی۔اگر وہ کسی فوجی ایڈونچر میں نہ پڑنے کے سیاسی منشور سے پیچھے ہٹتے ہوئے ایسا کوئی کام کرتے بھی ہیں تو ان کو بہت سے وسائل کی ضرورت پڑے گی۔اور ان کو یہ وسائل مہیا کرنے کے لیے بہت سے دوسری معاملات پر کمپرومائز کرنا پڑے گا، جیسا کہ شمالی کوریا کو سنبھالنا اور چین وروس کی پیش قدمی کو روکنا۔نہ ہی واشنگٹن اس کام کے لیے (یعنی ایران سے نمٹنا) اپنے عرب اتحادیوں پر بھروسا کر سکتا ہے۔وہ ایران کو عرب دنیا سے نکالنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور نہ ہی ماضی کی طرح وہ ایرانی اثر ورسوخ کی جگہ لے سکتے ہیں۔اور خطے میں کسی بھی قسم کے تنازعے کی صورت میں امریکا کو مجبوراً مداخلت کرنی پڑے گی۔

اگر امریکا ایران کو قابو کرنے کے لیے درکار وسائل مہیا

بھی کر دیتا ہے، تو ایسا کرنے سے خطے میں استحکام نہیں آئے گا۔ ایران مشرق وسطیٰ میں پائیدار امن کا لازمی جز ہے۔ فوجی ٹکراؤ ایران کو اس بات پر مجبور کرے گا کہ وہ "آگے بڑھ کر دفاع" کرنے کی پالیسی کو جاری رکھے، جس کے نتیجے میں نہ صرف مداخلت بڑھے گی بلکہ خطے میں عدم استحکام بھی بڑھے گا۔ بحرین، اردن، قطر اور متحدہ عرب امارات جیسی مستحکم ریاستیں عدم استحکام کا شکار ہو جائیں گی، اور عراق اور لبنان جیسے کمزور ممالک خانہ جنگی کا شکار ہو جائیں گے جیسا کہ حالیہ سالوں میں لیبیا اور یمن ہوئے ہیں۔ اور سب سے اہم یہ کہ امریکا کو انسانی بحران، اور داعش جیسے دیگر دہشت گرد گروہوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

خطے میں ایران کو تنہا کرنے کی منصوبہ بندی کرنے کے بجائے امریکا کو ایسی حکمت عملی کی ضرورت ہے جس میں ایران کا بھی کردار ہو۔ ایران کو یہ یقین دلانا ہوگا کہ خطے میں روسی حمایت یافتہ کسی منصوبہ بندی میں شامل ہونے کے بجائے امریکا اور اس کے اتحادیوں کے ساتھ کام کرنا اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ اور اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے امریکا کو طاقت کے بجائے سفارت کاری پر انحصار کرنا ہوگا۔ واشنگٹن کو چاہیے کہ ایٹمی معاہدے کو جاری رکھے اور ایران کے ساتھ کشیدگی کم کرنے کے لیے اس سے براہ راست تعلقات قائم کرے۔ اس کے علاوہ سعودی عرب اور ایران دونوں کو اس بات راضی کرنے کی کوشش کرے کہ وہ مل جل کر خطے کے مسائل حل کریں، جن میں سب سے اہم یمن اور شام کا مسئلہ ہے۔

سعودی عرب کے امریکا پر حالیہ اعتماد سے امریکا کو وہ کام لینے چاہئیں جو اوباما انتظامیہ لینے میں ناکام رہی۔ امریکا کو عالمی سفارت کاری کا استعمال کرتے ہوئے ان تنازعات کا حل تلاش کرنا چاہیے اور خطے میں امن و استحکام کے قیام کے لیے جامع منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ اور یہ کام روس کے لیے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ اگرچہ یہ کام مشکل ہے خاص کر ایسے حالات میں جب امریکا نے ایٹمی معاہدے سے حاصل ہونے والے سفارتی فوائد کو بھی لات مار دی ہے۔ لیکن اس کے متبادل جتنے بھی "آپشنز" ہیں وہ تصادم بڑھائیں گے اور مشرق وسطیٰ کو مزید جنگوں میں دھکیل دیں گے۔

(ترجمہ: حافظ محمد نوید نون)

"Iran among the ruins".
("Foreign Affairs". March/April 2018)

اسرائیل کا سوویٹو

Robert Wintemute

اسرائیل نے بھی نسل پرستی کو اُسی طور اپنایا ہے، جس طور جنوبی افریقا میں سفید فام اقلیت نے اپنایا تھا۔ جس طور جنوبی افریقا میں سوویٹو تھا اُسی طور اسرائیل میں فلسطین ہے۔ سوویٹو بھی ایک دن ختم ہوئی، اسرائیل میں بھی نسل پرستی پر مبنی نظام ایک دن دم توڑے گا۔

۲۱ مارچ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ یکساں حقوق کے لیے آواز بلند کرنے اور احتجاج کرنے والے سیاہ فام باشندوں پر جنوبی افریقا کی نسل پرست انتظامیہ کے تعینات کردہ پولیس اہلکاروں اور فوجیوں نے گولیاں برسائیں۔ یہ واقعہ شرپے ولے کا ہے۔ ۱۶ جون ۱۹۷۶ء کو یہی سب کچھ سیاہ فاموں کی بستی سوویٹو میں ہوا۔ ۲۴ مئی ۲۰۱۸ء کو یہ سب کچھ غزہ میں اسرائیلی اہلکاروں کے ہاتھوں ہوا اور ان کا نشانہ بنے فلسطینی۔

ایک سا تشدد، ایک سا نظام؟

اسرائیل نے وہی اطوار اپنائے ہیں، جو جنوبی افریقا کی نسل پرست انتظامیہ نے اپنائے تھے۔ ایک طرف تو فلسطینیوں کا بائیکاٹ کیا جا رہا ہے۔ انہیں کام کرنے اور ڈھنگ سے کمانے کے حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ دوسری طرف ان کے علاقوں میں سرمایہ کاری نہیں ہونے دی جا رہی۔ تجارتی اور صنعتی اعتبار سے فلسطینی انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں ہیں۔ ان کے لیے باعزت طریقے سے اپنے اور اہل خانہ کے لیے تین وقت کی روٹی کا اہتمام کرنا بھی انتہائی دشوار ہو چکا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ طرح طرح کی پابندیاں بھی عائد کی جا رہی ہیں۔ یہ بنیادی حقوق کی صریح خلاف ورزی ہے کیونکہ غزہ اور دیگر فلسطینی علاقوں میں پابندیوں کے ہاتھوں صحتِ عامہ کا بحران سر اٹھا چکا ہے۔ ادویہ اور ضروری طبی سامان کی قلت نے ہزاروں فلسطینیوں کی زندگی داؤ پر لگا دی ہے۔ اسرائیل نے جو سلوک فلسطینیوں سے روا رکھا ہے اس کی دنیا بھر میں مذمت کی جا رہی ہے۔ ایسے میں یہ بات بہت عجیب دکھائی دیتی ہے کہ کوئی اسرائیلی پالیسیوں کو غلط قرار نہ دے اور ان کی حمایت کرے۔ رچرڈ گولڈ اسٹون کا یہی معاملہ ہے۔ جنوبی افریقا کے ڈیسمنڈ ٹوٹو نے کہا ہے کہ جو کچھ جنوبی افریقا میں ہوا کرتا تھا وہی کچھ اسرائیل کر رہا ہے۔ رچرڈ گولڈ اسٹون جنوبی افریقا کا سفید فام یہودی ہے جس کا کہنا ہے کہ اسرائیل کچھ غلط نہیں کر رہا، بلکہ اس کے اقدامات کو کسی اور رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جنوبی افریقا میں جو نسل پرستی اپنائی گئی تھی اس کی بنیاد دو باتوں پر تھی۔ اول تو یہ ہے کہ سیاہ فام آبادی کو برابر کے شہری نہ سمجھا جائے یعنی انہیں چند بنیادی حقوق سے محروم رکھا جائے اور دوسرے یہ کہ انہیں ووٹ کا حق کسی بھی حال میں نہ دیا جائے۔ ووٹ کا حق ملنے کا مفہوم اس کے سوا کیا ہے کہ انسان اپنے لیے اپنی مرضی سے نمائندہ منتخب کرے اور اپنی مرضی کی حکومت تشکیل دینے میں کلیدی کردار ادا کرے۔ یہی سبب تھا کہ جنوبی افریقا میں سیاہ فام باشندوں کو الگ تھلگ رکھا جاتا تھا۔ انہیں حکومتی امور سے متعلق کچھ کہنے کی اجازت نہ تھی۔ وہ معاشی معاملات میں کچھ بھی کہنے کے حقدار نہ تھے۔ سیاسی معاملات میں تو اُنہیں اُف بھی کرنے کی اجازت نہ تھی۔ ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والی نسلیں فطری طور پر کمزور ہوتی ہیں۔ ان میں اعتماد نہیں ہوتا۔

تاریخ کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ نسل پرستی کا آغاز امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں ہوا۔ سفید فام یورپی باشندے جب ان ممالک میں پہنچے تو تعداد میں بہت کم تھے۔ لازم تھا کہ مقامی آبادیوں کو کسی نہ کسی طور منقسم اور الگ تھلگ رکھا جائے۔ افریقا میں بھی یورپ کے لوگوں نے یہی کیا۔ وہاں آباد ہونے والے یورپی باشندوں نے سیاہ فام باشندوں کو گرفتار کر کے غلام بنایا اور پھر بیگار کے لیے یورپ اور امریکا بھیج دیا۔ اس صورت میں یورپی آبادگاروں کے لیے افریقی سرزمین پر باقی ماندہ لوگوں کو کنٹرول کرنا بہت آسان ہو گیا۔ مئی ۱۹۴۸ء میں جنوبی افریقا میں سفید فام یورپی اقلیت کو سیاہ فام اکثریت اور مئی ۱۹۴۸ء میں فلسطین میں سفید فام یورپی نسل کے یہودیوں کو فلسطینی اکثریت کا سامنا کرنا پڑا۔

جنوبی افریقا میں سفید فام اقلیت کے سامنے انتہائی امتیازی سلوک پر مبنی پالیسی اپنانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس نے سیاہ فام اکثریت کو تمام بنیادی حقوق سے یکسر محروم کر دیا۔ ووٹ کاسٹ کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ دوسری طرف اسرائیل میں معاملہ یہ تھا کہ نسل پرستی کو ڈھکے چھپے انداز

سے اپنایا گیا۔ سات لاکھ عرب باشندوں کو ان کی سرزمین سے بے دخل کرنے کے بعد وہ علاقہ اسرائیل کا حصہ بنالیا گیا۔ اقوام متحدہ کے طے کردہ تمام اصولوں کو یکسر بالائے طاق رکھتے ہوئے اسرائیلی حکومت نے ان عرب باشندوں کو واپسی کا حق دینے سے بھی محض اس دلیل کی بنیاد پر انکار کردیا کہ یہ نسلی یہودی نہیں، اس لیے ان علاقوں پر ان کا کوئی حق نہیں۔ اکثریت یقینی بنانے کے اس طریق کار کو دنیا بھر میں شدید تنقید کا نشانہ بنایا جاتا رہا ہے، بھرپور مذمت کی جاتی رہی ہے۔ جن علاقوں میں عرب ۵۵ فیصد تھے وہاں، اسرائیلی اقدام کے بعد، یہودی ۸۰ فیصد ہوگئے۔

آج غزہ میں انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں زندگی بسر کرنے والے فلسطینی دراصل وہی عرب باشندے اور ان کی اولادیں ہیں جنہیں اسرائیلیوں نے ۱۹۴۸ء میں اپنی سرزمین سے بے دخل کردیا تھا۔ جب یہ فلسطینی غزہ اور ۱۹۴۹ء سے ۱۹۶۷ء تک کے اسرائیل کی سرحد پر جمع ہوکر اپنی آبائی زمین کی طرف مارچ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو نسل پرستانہ نظام کو چیلنج کرتے ہیں۔ بنیادی حقوق سے متعلق بین الاقوامی قانون (بشمول قبرص، آرمینیا اور آذربائیجان سے متعلق یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس کے فیصلے) کسی بھی نسلی آبادی کو اُس کی آبائی سرزمین سے نزدیک ترین علاقوں کو واپس جانے کا حق دیتا ہے۔

بیشتر اسرائیلی اس بات کے خلاف ہیں کہ فلسطینیوں کو ان کی زمینوں پر واپسی کا حق دیا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے ان کی اکثریت قائم ہوجائے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یہ غلط ہے تو پھر ۱۹۴۸ء میں مصنوعی طریقے سے معرض وجود میں لائی جانے والی یہودی اکثریت کو برقرار رکھنا کیوں درست ہے؟

اسرائیل نے ۱۹۶۷ء میں جنوبی افریقا کی نسل پرست پالیسی اپنایا۔ غرب اردن، مشرقی بیت المقدس اور غزہ پر قبضہ کرنے کے بعد اسرائیل نے وہاں کے شہریوں کو شہریت کے حق سے بھی محروم کردیا۔ واضح رہے کہ جنوبی افریقا میں سفید فام اکثریت کا امتیازی نظام ۴۶ سال برقرار رہا تھا جبکہ اسرائیل میں اپنایا جانے والا امتیازی نظام نصف صدی پوری کرچکا ہے۔ اسرائیل کی حکومت اب تک اس پورے معاملے کو ''عارضی'' قرار دیتی آئی ہے۔ غرب اردن میں نئی بستیاں بسا کر پانچ لاکھ سے زائد یہودیوں کو آباد کیا جاچکا ہے۔ غزہ میں رہنے والے اگرچہ اسرائیل کے ماتحت ہیں مگر انہیں اسرائیل کی شہریت دی گئی ہے، نہ ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا ہے۔

اسرائیل کی حدود میں اب بھی ایسے لاکھوں عرب باشندے ہیں جنہیں شہریت ملی ہوئی ہے اور ووٹ ڈالنے کا حق بھی دیا گیا ہے۔ ایسے میں اسرائیل پر نسل پرستی کا الزام کیوں کر عائد کیا جاسکتا ہے؟ بات کچھ یوں ہے کہ ۱۹۴۸ء میں عرب باشندوں کو ان کے علاقوں سے نکالنے کے بعد اسرائیلی حدود میں جو عرب رہ گئے تھے انہیں شہریت دیے بغیر چارہ نہ تھا اور یوں بھی بہت بڑے پیمانے پر ناانصافیاں کرنے کے بعد چند ایک منصفانہ اقدامات سے تلافی ممکن نہیں۔

جنوبی افریقا کی نسل پرست حکومت پر جب غیر معمولی بین الاقوامی دباؤ پڑا تب اس نے طے کیا کہ سیاہ فام باشندوں کو دس چھوٹے چھوٹے خود مختار علاقوں میں بسا دیا جائے اور باقی ماندہ زمین یعنی بڑا ٹکڑا سفید فام اقلیت کے تصرف میں رکھا جائے۔ عالمی برادری نے یہ تجویز فوراً مسترد کردی کیونکہ اس میں کہیں بھی انصاف نہیں تھا۔ اسرائیل نے بھی کچھ ایسا ہی طریق کار اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چاہتا ہے کہ فلسطینیوں کو الگ تھلگ علاقوں میں بسا کر تھوڑی بہت خود مختاری دے دی جائے تاکہ دنیا کو دکھایا جاسکے کہ اسرائیل نے فلسطینیوں کو ریاست کے قیام کا حق دے دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیلی حکومت فلسطینیوں اور دیگر عرب باشندوں کو زیادہ سے زیادہ منقسم رکھنا چاہتی ہے تاکہ وہ کبھی ایک ہوکر اسرائیل کے خلاف کچھ نہ کرسکیں۔

اسرائیل نے سات عشروں کے دوران فلسطینیوں اور دیگر عرب باشندوں کو کچل کر رکھنے کی جس پالیسی پر عمل جاری رکھا ہے اسے بالکل درست قرار دینے والوں کی اسرائیل میں بھی کمی نہیں۔ وزیر تعلیم نفتالی بینیٹ کہتا ہے کہ اسرائیل نے جس طور مشرقی بیت المقدس، گولان کی پہاڑیوں اور غزہ پر قبضہ کیا تھا بالکل اسی طرح پورے غرب اردن پر بھی قبضہ کرلے۔ اس تجویز پر عمل کی صورت میں اسرائیل کی نسل پرستانہ پالیسی زیادہ شفاف ہوکر دنیا کے سامنے آئے گی۔

یورپ نے صدیوں تک یہودیوں پر جو مظالم ڈھائے تھے اور دوسری جنگ عظیم کے دوران جس طور یہودیوں کو قتل کیا گیا اس نے یورپ کی سفید فام اقوام میں شدید احساسِ جرم پیدا کیا۔ اور اس احساسِ جرم سے چھٹکارا پانے کے لیے انہوں نے طریقہ یہ سوچا کہ یہودیوں کو ان کی آبائی سرزمین پر بسا دیا جائے۔ اور اس سلسلے میں فلسطینیوں کو تختۂ مشق بنایا جائے۔ جو کچھ یورپی اقوام نے یہودیوں سے کیا، وہی سب کچھ فلسطینیوں سے ہونے دیا گیا۔ سات عشروں سے فلسطینی اور عرب باشندے شدید امتیازی سلوک، تشدد اور قتل و غارت کا سامنا کر رہے ہیں۔ اسرائیل کو فلسطینیوں سے کھل کر ناانصافی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل نے زیادہ نسل پرستی کا مظاہرہ کیا ہے اور وہ بھی زیادہ طویل مدت تک۔

اسرائیل کے خلاف رائے عامہ ہموار ہوتی جارہی ہے۔ امریکی جامعات میں پڑھنے والے یہودی طلبہ بھی اب اس بات کو سمجھتے ہیں کہ فلسطینیوں سے سات عشروں تک ناانصافیاں روا رکھی گئی ہیں۔ اسرائیل کی نسل پرستانہ پالیسیاں اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اسرائیل پر بڑھتا ہوا دباؤ بالآخر فلسطینیوں کے لیے کسی ریاست کے حق کو لیے بغیر چین سے نہ بیٹھے گا۔ امریکا، یورپ اور دیگر خطوں میں اسرائیل کے خلاف فضا تیار ہوتی جارہی ہے۔

اگر اسرائیل کی حکومت دو ریاستوں کے نظریے کو قبول نہیں کرتی تو پھر اسے جنوبی افریقا کی طرز پر ایک ریاست کے نظریے کو تسلیم کرتے ہوئے تمام فلسطینی اور عرب باشندوں کو برابری کے حقوق دینا ہوں گے۔ فلسطینیوں کو اسرائیلی ریاست کی حدود میں برابری کے حقوق دیے جانے کی صورت میں معاملات بہت حد تک درست ہوسکتے ہیں۔ مگر شاید اسرائیلی حکومت اس کے لیے تیار نہ ہوگی کیونکہ فلسطینیوں کو برابری کے حقوق دیے جانے کی صورت میں اسرائیلی معاشرے میں ان کا اثر و نفوذ غیر معمولی حد تک بڑھ جائے گا۔ ایک ریاست کی حدود میں امتیازی سلوک ممکن نہ ہوگا۔ آئین بھی برابری کے حقوق کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ اگر ایسا ہو جائے تو اسرائیلی فوجیوں کے ہاتھوں جان سے ہاتھ دھونے والے فلسطینیوں کا خون رائیگاں نہ جائے گا۔

"Gaza is Israel's Soweto: Israel's apartheid will collapse, just as South Africa's did". ("al-jazeera.com". May 17, 2018)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی شائع کردہ کتاب

زندگی کے عام فقہی مسائل

(جلد اوّل تا سوم)

ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی

اکیڈمی بک سینٹر۔ D-35، بلاک۔5

فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ فون: 021-36809201

''جہاں ہمارے حضورﷺ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے''

آصف محمود

فلسطینیوں پر قیامت بیت گئی اور یہاں ہماری محفلیں شگوفہ بنی رہیں۔ یہ ہمیں کیا ہوگیا ہے؟ بستی میں ایسی بے حسی تو کبھی نہ تھی۔ درست کہ ہم آج کمزور ہیں اور فلسطینیوں کی عملی مدد سے قاصر ہیں۔ لیکن ہم اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ یہ دکھ امانت کی طرح سنبھال کر رکھیں اور نسلوں کو وراثت میں دے جائیں۔ کیا عجب ہماری نسلیں ہماری طرح بے بس نہ ہوں۔

وقت کا موسم بدل بھی تو سکتا ہے۔ ہم اتنا تو کر سکتے ہیں کہ موسموں کے بدلنے تک اپنے زخموں کو تازہ رکھیں۔ ان سے رستے لہو کو جمنے نہ دیں۔ بھلے وقتوں کی بات ہے ابھی روشن خیالی کی مسند مسخروں کے ہاتھ میں نہیں آئی تھی۔ ہمارا ادیب دائیں اور بائیں کی تقسیم سے بے نیاز ہو کر یہ امانت نسلوں تک پہنچا رہا تھا۔

اقبال، فیض، انتظار حسین، حبیب جالب، احمد ندیم قاسمی، ابن انشاء، احمد فراز، رئیس امروہوی، ن م راشد، مستنصر حسین تارڑ، قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، مظہر الاسلام، ادا جعفری، یوسف ظفر، منظور عارف، ضمیر جعفری، خاطر غزنوی، محمود شام، نذیر قیصر، شورش ملک، سلطان رشک، طاہر حنفی، بلقیس محمود۔۔۔ کتنے ہی نام ہیں جنہوں نے اپنے افسانوں اور نظموں میں اس دکھ کو آئندہ نسلوں کے لیے امانت کے طور پر محفوظ کر دیا۔ یہ مگر گزرے دنوں کی بات ہے۔

اب فلسطین سے دھواں اٹھتا ہے تو ایک مستنصر حسین تارڑ کا قلم نوحے لکھتا ہے۔ باقی ادیب کیا ہوئے؟ قلم ٹوٹ گئے، سیاہی خشک ہوگئی یا احساس نے دم توڑ دیا؟ برسوں پہلے انتظار حسین کا افسانہ ''شرم الحرم'' پڑھا تھا۔ کچھ فقرے آج بھی دل میں ترازو ہیں۔ ''بیت المقدس میں کون ہے؟ بیت المقدس میں تو میں ہوں۔ سب ہیں۔ کوئی نہیں ہے۔ بچے کمہار کے بنائے پتلے کوزوں کی طرح توڑے گئے، کنواریاں کنویں میں گرتے ہوئے ڈول کی رسی کی مانند لرزتی ہیں۔ ان کی پوشاکیں لیر لیر ہیں۔ بال کھلے ہیں۔ انہیں تو آفتاب نے بھی کھلے سر نہیں دیکھا تھا۔ عرب کے بہادر بیٹے بلند و بالا کھجوروں کی مانند میدانوں میں پڑے ہیں۔ صحرا کی ہواؤں نے ان پر بین کیے''۔

انتظار حسین ہی کے افسانے ''کانے دجال'' کو میں نے کتنی ہی بار پڑھا۔ یہ پیراگراف ہر دفعہ خون رلاتا ہے۔

''پلنگ پہ بیٹھی اماں جی چھالیاں کاٹتے رونے لگیں۔ انہوں نے سروتا تھالی میں رکھا اور آنچل سے آنسو پونچھنے لگیں۔ ابا جان کی آواز بھر آئی تھی مگر ضبط کر گئے۔ اپنے پروقار لہجے میں شروع ہو گئے: آنحضورؐ دریاؤں، پہاڑوں، صحراؤں، سے گزرتے چلے گئے۔ مسجد اقصیٰ میں جا کر قیام کیا۔ حضرت جبریلؑ نے عرض کیا یا حضرتؐ تشریف لے چلیے، آپؐ نے پوچھا کہاں؟ بولے کہ یا حضرتؐ زمین کا سفر تمام ہوا۔ یہ منزل آخر تھی۔ اب عالم بالا کا سفر درپیش ہے۔ تب حضورؐ بلند ہوئے اور بلند ہوتے چلے گئے۔۔۔۔

ابا جان کا سر جھک گیا۔ پھر انہوں نے ٹھنڈا سانس بھرا۔ بولے ''جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے''۔

لڑکپن جوانی میں بدلا اور جوانی ڈھل چلی، کنپٹیوں کے بال اب سفید ہو رہے ہیں اور عائشہ اب چہچہاتی ہے کہ بابا آپ تو بڈھے ہو گئے۔ لیکن یہ فقرہ آج بھی نیزے کی انی کی طرح وجود میں پیوست ہے ''جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہو گئے''۔ عشروں پہلے بھی یہ فقرہ پڑھا تو آگے پڑھا نہ گیا۔ آج بھی یہاں پہنچتا ہوں تو آنکھوں میں دھند اتر آتی ہے اور افسانہ ایک طرف رکھ دیتا ہوں۔

منیر نیازی والا معاملہ درپیش ہوتا ہے: ''اس کے بعد اک لمبی چُپ اور تیز ہوا کا شور''۔ لمحہ موجود کی روشن خیالی کا تو سارا بانکپن ہی مسلمانوں پر غرانے اور غراتے رہنے میں ہے۔ میں مگر بھلے وقتوں کی بات کر رہا ہوں۔ جب روشن خیالی کی مسند ابھی مسخروں کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ تب فیض احمد فیض نے فلسطینی مجاہدوں کے لیے ایک ترانہ لکھا تو قرآن کی آیت کو عنوان بنا دیا: ''لاخوف علیھم''۔

ابن انشاء کی دیوارِ گریہ پڑھیے، فیض کی سرِ وادیِ سینا کو دیکھیے، ادا جعفری کی مسجد اقصیٰ پر نگاہ ڈالیے، منظور عارف کے 'آئینے کے داغ' دیکھیے، احمد فراز کے 'بیروت' کو دیکھیے، رئیس امروہوی کا 'فدیہ' اور محمود شام کی 'بنت اقصیٰ' دیکھیے، آپ کو سطر سطر یہ دکھ تازہ ملے گا۔ انہوں نے اس دکھ کو اگلی نسلوں تک امانت کے طور پر پہنچایا۔

اس امانت میں صرف درد کا احساس ہی نہیں وقت کے موسموں کے بدلنے کی آس بھی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ''خانہ بدوش'' کا آخری پیراگراف پڑھیے: ''میں سینکڑوں فلسطینیوں سے مل چکا تھا۔ مگر احمد ایک مختلف انسان تھا۔ وہ حقارت سے اسرائیل کا ذکر کرتا تھا بلکہ ایک سپاٹ اور کاروباری انداز میں۔ وطن اس کے لیے ایک اغوا شدہ بچہ تھا جو جذباتی ہونے سے نہیں مل سکتا تھا۔ اس کی تلاش میں اس کے نقش نہیں بھولنے تھے اور ایک سرد منصوبہ بندی سے خرکار کیمپ تک پہنچنا تھا''۔ یہی نقش ہم بھولتے جا رہے ہیں۔ یہ نقش کیسے یاد رہتے ہیں؟ ماؤں کی لوریاں انہیں تازہ رکھتی ہیں، نصاب تعلیم تذکیر کا کام کرتا ہے، ادیب اور شاعر کا قلم اسے سنوارتا رہتا ہے۔ ماؤں کے پاس اب وقت نہیں، باپ کی جانے بلا، فلسطین کیا ہے؟ نصاب تعلیم اجنبی ہو چکا، اور ادیب و شاعر گونگے ہو چکے۔

ایک یلغار ہے جس نے سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فلسطین کی بات کرنا اب دقیانوسی رویہ ہے۔ اب تو مطالعہ پاکستان بھی مسخروں کے مزاح کا عنوان بن چکا۔ مسلمانوں کے دکھ پر رونا اب انتہا پسندی بن چکا۔ بیانیہ اب وہی ہے جو مغرب سے آتا ہے اور مسلمانوں کے حقوق انسانی نہیں ہوتے۔ ہم نے اپنے نصاب کو جانے کن کن فضولیات سے بھر رکھا ہے۔ کیا اس میں فلسطین کے محمود درویش کی دو نظمیں ہم شامل نہیں کر سکتے۔

کبھی آپ محمود درویش کو پڑھ کر تو دیکھیے۔ میں انگریزی ادب کا طالب علم ہوں اور ورڈز ورتھ، کیٹس، بائرن، شیلے، ییٹس، براؤننگ، ہارڈی، جان ڈن، شیکسپیئر، ملٹن سمیت کتنوں کو پڑھ رکھا ہے لیکن جو بات محمود درویش میں ہے وہ ان میں کہاں۔ محمود درویش، نزار قبانی، سمیع قاسم، فوزی اسمر، حنا ابوحنا، توفیق زیاد، توفیق فیاض، امین حبیبی، ایک کہکشاں آباد ہے ہمیں جس کا علم ہی نہیں۔ سمیع قاسم کی نظم ''ارم'' تو کمال ہے۔ ابداعلی ھذا الطریق، رایا تا بصر الضریر۔ ہمیشہ سے اس راستے پر ہمارے پرچم اندھوں کے لیے بصارت بنے ہیں۔

محمود درویش کہتا: ''ویشتمنا اعادینا، ھلا! ھمج ہم، عرب۔ نعم عرب''۔ ہمارے دشمن آوازے کستے ہیں، یہ عرب ہیں، یہ اجڈ ہیں اور وحشی۔ ہاں سن رکھو ہم عرب ہیں۔ درویش کے ''انا شیدکوبا'' کا تو جواب نہیں۔

ذرا نزار قبانی کی یہ نظم دیکھیے: ''آل اسرائیل! ایسا ترانا بھی کیا؟ گھڑی کی سوئیاں آج رک گئیں تو کیا ہوا کل یہ پھر سے چل پڑیں گی۔ زمین کے چھن جانے کا غم نہیں باز کے پر بھی جھڑ جایا کرتے ہیں۔ طویل تشنگی کا بھی ڈر نہیں کہ پانی ہمیشہ چٹانوں کی تہہ میں ہوتا ہے۔ تم نے فوجوں کو ہرا دیا لیکن

تم شعور کو شکست نہیں دے سکے۔ تم نے درختوں کی چوٹیاں کاٹ ڈالیں جڑیں مگر باقی ہیں‘‘۔ ہم آج بے بس سہی، مگر جڑیں تو باقی ہیں۔ ان جڑوں کی آبیاری تو ہم کر ہی سکتے ہیں۔ ہم اپنے دکھوں کا مداوا نہیں کر سکتے لیکن ہم ان دکھوں کو سنبھال کر تو رکھ سکتے ہیں۔ ہم اس امانت کو اگلی نسل کو تو سونپ سکتے ہیں۔ کیا عجب ہماری نسلیں ہماری طرح بے بس نہ ہوں۔ وقت کا موسم بدل بھی تو سکتا ہے۔

محمود درویش نے کہا تھا: ’’اے میرے وطن میری زنجیروں نے مجھے عقاب کی سختی اور رجائی کی نرمی سکھائی معلوم نہ تھا ہماری کھال کے نیچے طوفان جنم لیں گے اور دریاؤں کا وصل ہوگا انہوں نے مجھے کوٹھڑی میں قید کیا میرے دل نے وہاں مشعلیں فروزاں کر دیں انہوں نے دیوار پر میرا نمبر لکھا لیکن دیواریں مرغزار ہوگئیں انہوں نے میرے جلاد کی تصویر بنائی روشن زلفوں سے اسے چھپا لیا میں نے شکست کو اٹھا کر پٹخ دیا اور فاتحین نے تو صرف زلزلوں کو جگایا ہے‘‘۔ ہم کیسے بھول جائیں ’’جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہوگئے‘‘۔

یہ دکھ ہماری اگلی نسل کی امانت ہے۔ آپ کے آنگن میں بچے کھیل رہے ہوں گے۔ افطار کے بعد انہیں بلایے، پاس بٹھایے اور یہ دکھ ان کی رگ جاں میں انڈیل دیجیے کہ ’’جہاں ہمارے حضورؐ بلند ہوئے تھے، وہاں ہم پست ہوگئے‘‘۔

(بحوالہ: ’’ہم سب ڈاٹ کام ڈاٹ پی کے‘‘۔ ۱۹ مئی ۲۰۱۸ء)

بقیہ: غزہ: میں نے مارچ میں شرکت کیوں کی؟

جدوجہد کا راستہ ہے۔ ہم عزت کی موت کو زندگی پر ترجیح دیں گے، ہمیں برسوں دھوکا، آس و امید کے درمیان رکھا گیا۔ بالآخر ہم نے اس فیصلہ کن تحریک کا آغاز کر دیا ہے۔

اپنی تحریک کو کامیابی سے منطقی انجام تک پہنچانے کے لیے ہمیں جنوبی افریقا کی عوامی جدوجہد سے سیکھنا ہوگا، یعنی زیادہ سے زیادہ عوام کو اس جدوجہد اور مشن کے لیے متحرک کیا جائے۔ ہمیں مختلف حکومتوں سے آزادی کی بھیک مانگنے کا رویہ بھی ترک کرنا ہوگا۔ کیا جنوبی افریقا کو مارگریٹ تھیچر اور رونالڈ ریگن کی ہمدردیوں سے کچھ حاصل ہوا؟ نہیں بلکہ افریقی عوام اور دنیا بھر کے باضمیر انسانوں کی کوششوں اور مزاحمت سے ہی نسل پرستی کی عفریت کا مقابلہ ممکن ہوا تھا۔

ہماری جدوجہد اور تحریک اخلاقی بنیادوں پر استوار ہے، لہٰذا ہمیں فتح اور کامیابی، استقامت، عزیمت اور قربانیوں سے حاصل ہوگی۔ ان شاء اللہ! (ترجمہ: محمود الحق صدیقی)

"Why I marched on may 14 in Gaza near the Israeli fence". ("aljazeera.com". May 16, 2018)

اسلحہ کی عالمی تجارت میں چین کا نمایاں کردار

دہائیوں کی معاشی ترقی اور فوج کو جدید ہتھیاروں سے آراستہ کرنے کے بعد اب چین ہتھیاروں کی عالمی تجارت میں ایک اہم کردار بن چکا ہے۔ گزشتہ کئی سالوں تک چین اپنے برآمد شدہ ہتھیاروں سے کئی گنا زیادہ روایتی ہتھیار درآمد کرتا رہا، لیکن ۲۰۱۳ء کے بعد سے چین کی ہتھیاروں کی برآمدات اس کی درآمدات سے بڑھ چکی ہیں۔ ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۷ء کے درمیان چین نے دنیا بھر میں ۱۴ء۴ ارب ڈالر کے روایتی ہتھیار برآمد کیے۔ جس کی وجہ سے یہ امریکا، روس، فرانس اور جرمنی کے بعد اسلحہ برآمد کرنے والا دنیا کا پانچواں بڑا ملک بن چکا ہے۔

اسٹاک ہوم انٹرنیشنل پیس ریسرچ انسٹیٹیوٹ کے مطابق چین کی روایتی ہتھیاروں کی فروخت ۲۰۰۸ء میں ۶۵۰ ملین ڈالر سے بڑھ کر ۲۰۱۷ء میں ۱۳ء۱ ارب ڈالر تک پہنچ چکی ہے۔ اس برآمدات کا ۷۴ فی صد حصہ ایشیا اور ۲۱ فی صد افریقا برآمد کیا گیا۔ اگرچہ چین ہتھیاروں کی برآمدات میں ایک مقام حاصل کر چکا ہے، لیکن ابھی بھی چین کی تجارتی حیثیت امریکا کے مقابلے میں کم ہے۔ گزشتہ دس سال سے امریکا کی سالانہ اوسط برآمدات ۹ ارب ڈالر ہے۔

چین کی زیادہ تر برآمدات قریبی ممالک کو ہی فروخت کی جاتی ہیں۔ گزشتہ دہائی تک ہتھیاروں کی برآمدات کم ہونے کے باوجود ان کا ایک بڑا حصہ (۸۲.۸ فی صد) ایشیائی ممالک کو برآمد کیا گیا۔ یہ رجحان برقرار رہا اور ۲۰۰۸ء کے بعد سے چین کی اسلحے کی برآمدات کا ۶۲ء۴ فی صد پاکستان، بنگلا دیش اور میانمار بھیجا جاتا ہے۔

گزشتہ دہائی سے جنوبی ایشیا اور اور جنوب مشرقی ایشیا میں چین کی اسلحے کی برآمدات ۲۰۰۸ء مین ۳۸۶ ملین ڈالر سے بڑھ کر ۲۰۱۶ء میں ۱ء۵ ارب ڈالر ہوگئی، تاہم ۲۰۱۷ء میں یہ کم ہو کر ۹۴۸ ملین ڈالر رہ گئی۔ چین ابھی بھی خطے میں اسلحہ برآمد کرنے والے ممالک سے پیچھے ہے۔ ۲۰۰۸ء سے امریکا ایشیا (مشرق وسطیٰ کے علاوہ) میں ۲ء۲۷ بلین ڈالر کا روایتی اسلحہ برآمد کر چکا ہے۔

پاکستان اور چین کے درمیان فوجی تعاون کی وجہ سے چین پاکستان کو کسی دوسرے ملک کے مقابلے میں زیادہ ہتھیار مہیا کرتا ہے۔ اکثر اس کی وجہ سیاسی مقاصد کا حصول ہوتی ہے۔ چین اور پاکستان کے درمیان انسداد دہشت گردی کے حوالے سے بڑھتے ہوئے تعاون کی وجہ سے ہتھیاروں کی فروخت ۲۰۰۸ء میں ۲۵۰ ملین ڈالر سے بڑھ کر ۲۰۰۹ء میں ۷۵۰ ملین ڈالر تک پہنچ چکی تھی۔ جنوری کے وسط میں بھارت کی جانب سے طویل فاصلے تک مار کرنے والے بلیسٹک میزائل اگنی ۵ کا کامیاب تجربہ کیا گیا۔ کچھ ہفتوں بعد مارچ میں چین نے پاکستان کو ایک سے زائد وار ہیڈ کے حامل جوہری میزائل میں استعمال ہونے والے آپٹیکل ٹریکنگ سسٹم کی فروخت کا اعلان کر دیا۔ اس کے علاوہ JF-17 کی تیاری پاکستان اور چین کے درمیان باہمی اشتراک کو ظاہر کرتی ہے۔

بنگلا دیش بھی چینی اسلحے کا ایک بڑا خریدار ہے۔ ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۷ء کے درمیان چین نے بنگلا دیش کو ۱ء۸۶ ارب ڈالر کے ہتھیار فراہم کیے۔ یہ اُس عرصے میں بنگلا دیش کی عسکری خریداری کا ۷۱.۹ فی صد تھا۔ اس خریداری نے چین کو بنگلا دیش کا سب سے بڑا اسلحہ سپلائر بنا دیا۔ چین ہتھیاروں کے حصول کو آسان بنانے کے لیے قرضوں اور کم قیمت کی پیش کش کرتا ہے۔ ۲۰۱۳ء میں چین نے بنگلا دیش کو دو استعمال شدہ آبدوزیں فروخت کیں اور ہر ایک آبدوز کی قیمت ۱۰۰ ملین ڈالر سے کچھ زائد تھی۔ چین بنگلا دیش کو ۱۶ ہزار سے زیادہ رائفلیں اور ۴ ہزار سے زیادہ پستولیں فراہم کر چکا ہے۔

میانمار ایشیا میں چین کی دفاعی برآمدات کی تیسری بڑی منڈی ہے۔ ۲۰۱۰ء میں میانمار پر عائد پابندیوں میں نرمی کے بعد اس نے ہتھیاروں کے حصول میں تیزی سے اضافہ کیا، جس کا چین نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ گزشتہ ۶ سال میں میانمار نے چین سے ۹۵۴ ملین ڈالر کے روایتی ہتھیار درآمد کیے۔ مہنگے ترین ہتھیاروں میں JF-17 ہوائی جہاز، ۱۲ ڈرون، ۲ بحری جنگی جہاز اور ۷۶ بکتر بند گاڑیاں شامل ہیں۔

۲۰۱۷ء ایشیا میں چینی اسلحے کی فروخت

ملک	برآمدات (ملین ڈالر)	فی صد
پاکستان	۶۰۷۴	۵۲ء۸
بنگلا دیش	۲۱۰۶	۱۸ء۳
میانمار	۱۲۷۵	۱۱ء۱
ایران	۳۶۷	۳ء۲
انڈونیشیا	۳۱۳	۲ء۷

ایشیا کے دیگر ممالک: ۱۳۶۰:۱۱ء۸

۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائی میں چین کی اسلحے کی برآمدات میں افریقی ممالک کا حصہ ۱۵ فی صد تھا۔لیکن خطے میں چین کا اثر ورسوخ بڑھنے کے بعد اس میں اضافہ ہوا ہے۔ ۲۰۰۸ء کے بعد سے افریقی ممالک نے تقریباً ۳ ارب ڈالر کا اسلحہ چین سے خریدا جو کہ چین کی ہتھیاروں کی برآمدات کا ۲۱ فیصد ہے۔ افریقا میں چین کے اسلحے کی برآمدات کا ۴۲ فیصد حصہ شمالی افریقا کے ممالک، ۲۹ فی صد مشرقی افریقا کے ممالک اور باقی ۲۹ فی صد دیگر افریقی ممالک کو جاتا ہے۔

اس طرح کی نسبتاً پھیلی ہوئی منڈی اسلحہ فروخت کرنے والے بڑے ممالک کے لیے غیر معمولی بات ہے۔امریکا نے پچھلی ایک دہائی میں ۹ء۴ ارب ڈالر کا اسلحہ افریقا برآمد کیا، جس میں سے ۸۷ فی صد صرف مصر اور مراکش نے ہی خرید لیا۔اسی عرصے میں الجیریا اور مصر نے افریقا برآمد کیے گئے روسی اسلحے کا ۸۴ فی صد اسلحہ خریدا۔گزشتہ ایک دہائی میں افریقی ممالک کو روس ۴ء۱۲ ارب ڈالر، امریکا ۹ء۴ ارب ڈالر اور چین تقریباً ۳ ارب ڈالر کے ہتھیار فروخت کر چکے ہیں۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ چینی اسلحہ اگرچہ دیگر ممالک کے ہتھیاروں کے مقابلے میں کم درجے کا ہوتا ہے لیکن یہ اپنی کم قیمت کی وجہ سے مقبول ہو رہے ہیں۔چینی محکمہ دفاع کے مطابق چینی ساختہ اسلحہ قیمت میں دیگر ممالک کے اسلحے سے کم ہونے کے باوجود جدید خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر افریقا میں موجود تربیتی طیاروں کا ۸۰ فی صد کم قیمت K-8 تربیتی طیاروں پر مشتمل ہے۔

چین الجیریا جیسی منڈی میں اپنے قدم جمانے کی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔الجیریا کو چینی برآمدات کا حجم ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۴ء تک ۴۸۳ ملین ڈالر رہا لیکن صرف ۲۰۱۵ء میں ہی یہ ۲۴۷ ملین ڈالر تک پہنچ گیا اور ۲۰۱۶ء میں ۴۹۹ ملین ڈالر کی بلند ترین سطح پر پہنچ گیا۔اس خریداری میں ۳ C-28A بحری جنگی جہاز بھی شامل تھے جن کی خریداری کا معاہدہ ۲۰۱۲ء میں ہوا تھا۔

چین نئی ٹیکنالوجی کے ساتھ اپنے داخلی قوانین اور پالیسیوں کو تبدیل کرنے میں کامیاب رہا۔جس کی وجہ سے چین نے دیگر اسلحہ فراہم کرنے والے ممالک کی جانب سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کیا۔امریکا جو کہ ڈرونز کی تیاری میں سب سے آگے ہے، اِن کی برآمدات کو محدود کیے ہوئے ہے۔امریکی قوانین کے مطابق یہ ڈرونز جو کروز میزائل جیسی خصوصیات کے حامل ہیں، اس وجہ سے ان کی برآمدات محدود ہے۔ان عوامل کی وجہ سے چین کو اپنے ڈرونز فروخت کرنے کا موقع ملا اور وہ نائیجیریا اور مصر جیسے ممالک کو ڈرونز فروخت کرنے کی پیشکش کر چکا ہے۔

یہ بات بھی غور طلب ہے کہ چینی ساختہ اسلحہ کئی شورش زدہ علاقوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔رپورٹ کے مطابق یہ اسلحہ کانگو، آئیوری کوسٹ، سوڈان اور صومالیہ میں جاری کشیدگی میں استعمال ہوا۔جولائی ۲۰۱۴ء میں China North Industries Corporation نے جنوبی سوڈان کی حکومت کو ۱۰۰ گائیڈڈ میزائل، ۹ ہزار سے زیادہ خودکار رائفلیں اور ۲۴ ملین گولیاں فراہم کیں۔تاہم جنوبی سوڈان کی حکومت کے اقدامات عالمی برادری کی جانب سے شدید تنقید کا نشانہ بنتے ہیں۔

گزشتہ دس سالوں میں امریکا میں چینی اسلحے کی فروخت میں اضافہ ہوا ہے۔۲۰۰۸ء میں چین نے مغربی ممالک کو صرف ۴۱ ملین ڈالر کا اسلحہ فروخت کیا۔یہ اعداد ۲۰۱۵ء میں ۱۷۸ ملین ڈالر تک پہنچ گئے۔لیکن ۲۰۱۶ء میں یہ صرف ۳۶ ملین ڈالر رہ گئے۔چین نے ۲۰۱۷ء کے دوران اس خطے میں ہتھیار فروخت نہیں کیے۔شمالی اور جنوبی امریکا کی اسلحے کی کل درآمدات میں سب سے بڑا حصہ (۱۹ فی صد) امریکی اسلحے کا ہے، دوسرے نمبر پر روس (۱۴ فی صد) اور تیسرے نمبر پر جرمنی (۱۲ فی صد) ہیں۔چین کے روایتی ہتھیار اس درآمدات کا صرف ۳ فی صد ہیں۔

خطے میں چین کی برآمدات کا ایک بڑا حصہ (۸۷.۴ فیصد) صرف وینز ویلا بھیجا جاتا ہے۔چین نے وینز ویلا کو ۲۰۱۰ء میں ۱۸ K-8 تربیتی طیارے، ۲۰۱۲ء میں ۱۲۱ VN-4 بکتر بند گاڑیاں اور ۲۰۱۷ء میں نامعلوم تعداد میں C-802 میزائل فروخت کیے۔

۲۰۰۸ء تا ۲۰۱۷ء شمالی و جنوبی امریکا میں چینی اسلحے کے پانچ بڑے خریدار

ملک	برآمدات (ملین ڈالر)	فی صد
وینز ویلا	۵۹۲	۸۷
بولیویا	۴۵	۷
ٹرینیڈاڈ و ٹوباگو	۱۶	۲
پیرو	۱۵	۲
ایکواڈور	۸	۱

یورپ کو چینی اسلحے کی برآمدات صرف ۱۶ ملین ڈالر کی ہے۔اس کے برعکس چین کی اسلحے کی کل درآمدات (۸ء۱۲ بلین ڈالر) کا تقریباً ۹۹ فی صد حصہ یورپ سے آتا ہے۔اس رجحان کی وجہ روس ہے جو چین کو اس کے بیرونی اسلحہ کی کل خریداری کا ۶۷ فی صد فراہم کرتا ہے۔لیکن اب یہ رجحان تبدیل ہو رہا ہے۔۲۰۰۶ء تک چین کو روسی ہتھیاروں کی فروخت اوسطاً ۵ء۲ ارب ڈالر رہی لیکن گزشتہ چند سالوں میں یہ صرف ۹۰۰ ملین ڈالر رہ گئی ہے۔

غیر ملکی ہتھیاروں کی خریداری میں کمی آنا چین کی ملکی سطح پر اسلحہ سازی کی بڑھتی ہوئی صلاحیت کا مظہر ہے۔جس کا ثبوت جدید ٹیکنالوجی کی ریورس انجینئرنگ کے ذریعے J-11 ہوائی جہاز اور HQ-9 میزائل کی تیاری ہے۔چین کی معاشی ترقی بھی اس سلسلے میں مددگار ثابت ہوئی۔چین امریکا کے بعد ریسرچ اینڈ ڈیولپمنٹ پر سب سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔

چین کی اسلحہ درآمد کرنے کی پالیسی تبدیل ہو رہی ہے۔ماضی میں چین مکمل wepon system خریدا کرتا تھا لیکن اب وہ صرف کچھ خاص پرزے خریدتا ہے اور انھیں اپنے ملک میں تیار کردہ ہتھیاروں میں استعمال کرتا ہے۔۲۰۱۲ء سے ۲۰۱۶ء کے درمیان چین نے روس سے جنگی جہازوں کے ۴۲۰ انجن اور ۴ SU-35 جہاز خریدے، یہ ماضی میں ہونے والی اس خریداری کا بالکل برعکس ہے کہ جب ۱۹۹۷ء سے ۲۰۰۱ء کے درمیان چین نے روس سے ۷۹ مکمل ہوائی جہاز اور صرف ۱۴ انجن خریدے تھے۔

چین کی روس سے جنگی جہازوں اور انجنوں کی خریداری

سال	جنگی جہاز	جہازوں کے انجن
۲۰۱۲ء تا ۲۰۱۶ء	۴	۴۲۴
۲۰۰۷ء تا ۲۰۱۱ء	۱۱	۲۰۲
۲۰۰۲ء تا ۲۰۰۶ء	۱۴۵	۷۰
۱۹۹۷ء تا ۲۰۰۱ء	۷۹	۴
۱۹۹۲ء تا ۱۹۹۶ء	۴۵	--
۱۹۸۷ء تا ۱۹۹۱ء	۳	--

یوکرین بھی چین کو انجن اور اس طرح کے دیگر ضروری پرزے فراہم کرتا ہے۔۲۰۱۱ء میں چین نے یوکرین سے ہوائی جہازوں کے لیے ۲۵۰ ٹربوفین اور فوجی ٹینکوں کے لیے ۵۰ انجن خریدے۔چین فرانس سے بھی اپنے بحری جہازوں کے لیے 16PC2.5 اور 12PC6 انجن خرید رہا ہے۔کچھ ایسے اشارے بھی موجود ہیں کہ چین فرانس سے غیر فوجی ہیلی کاپٹروں کے انجن خرید کر انھیں فوجی استعمال میں لانا چاہتا ہے۔

(ترجمہ و تلخیص: محمد عمید فاروقی)

"How dominant is China in the global arms trade?" ("chinapower.csis.org". April 30, 2018)

امریکا کو غصہ کیوں آتا ہے؟

تیسری قسط

غیر معمولی مستقبل کی تلاش

محمد ابراہیم خان

اب معاملہ چند افراد یا کسی گروہ تک محدود نہیں رہا تھا۔ جمہوریت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کے وعدے کے ساتھ قائم کیے جانے والے ملک کو استعماری اور نوآبادیاتی قوت میں تبدیل کرنے کا سوچا جا رہا تھا۔ ملک کو حقیقی استعماری قوت میں تبدیل کرنے کی باتیں اب واشنگٹن کے ایوانوں میں بھی گونجنے لگیں۔ پھر یہ ہوا کہ پوری کی پوری قومی سیاست اِسی ایک مقصد کے گرد گھومنے لگی۔ یہ گویا اِس امر کی طرف واضح اشارا تھا کہ امریکا جس مقصد کے تحت معرض وجود میں لایا گیا ہے اُسے بُھلا کر اب اُسی راہ پر گامزن ہونا ہے جس کی منزل انتہائی طاقتور حکمرانی ہے۔

۱۸۹۴ء میں ریاست کنیکٹیکٹ سے تعلق رکھنے والے سینیٹر اورویل پلیٹ نے کہا۔ ''میں اِس بات پر پوری طرح یقین رکھتا ہوں کہ ہمیں جب بھی اپنی سلامتی یا کاروباری معاملات کی توسیع کے لیے ملک سے باہر زمین کی ضرورت پڑے تو بلا تاخیر اور ضرورت کے مطابق زمین پر قبضہ کر لینا چاہیے''۔

اورویل پلیٹ نے جو کچھ کہا وہ محض اُس کی ذاتی رائے یا خواہش کا عکّاس نہ تھا۔ امریکا میں ایک ایسا گروپ پروان چڑھ چکا تھا جو انتہائی طاقتور تھا اور ریاستی قوت میں ناقابل یقین حد تک اضافہ کر کے آس پاس کی ریاستوں کو ہڑپ کرنے کے ساتھ ساتھ دور اُفتادہ ممالک کے خلاف بھی جنگ چھیڑنے کی خواہش رکھتا تھا۔

امریکا کے قائدین نے جو کچھ سوچ رکھا تھا اُسے ٹھوس حقیقت کی حیثیت سے سامنے لانے کے لیے بہت بڑے پیمانے پر ایسے اقدامات بھی درکار تھے جن میں کہیں کوئی بڑی خامی یا جھول نہ ہو۔ امریکا کو حقیقی استعماری قوت بنانے کے لیے لازم تھا کہ اُس کی بحری قوت غیر معمولی ہو اور اپنے مفادات کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے دنیا بھر میں کہیں بھی تیزی سے کارروائی کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ یہ کام کسی ایسے انسان کی نگرانی اور قیادت ہی میں ممکن بنایا جا سکتا تھا جس میں غیر معمولی جوش اور بھرپور جذبہ ہو۔ امریکی بحریہ کو عالمی تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی ذمہ داری تھیوڈور روز ویلٹ کو سونپی گئی۔ اور اُنہوں نے اس ذمہ داری سے بطریق احسن عہدہ برآ میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی۔

تھیوڈور روز ویلٹ نے ۱۸۹۷ء میں کہا تھا۔ ''میں کسی بھی ملک سے اور کسی بھی سطح پر جنگ کا خیر مقدم کروں گا۔ میں پورے اعتماد اور احساسِ ذمہ داری سے یہ بات کہتا ہوں کہ اِس ملک کو جنگ کی ضرورت ہے''۔

تھیوڈور روز ویلٹ نے جو کچھ کہا وہ محض اُن کا ذاتی بیان نہ تھا بلکہ بہت حد تک ریاستی پالیسی کا آئینہ دار تھا۔ روز ویلٹ کوئی عام آدمی نہ تھے کہ کوئی بات کہتے اور توجہ نہ دی جاتی۔ اُنہیں اندازہ تھا کہ جنگ کو پسند کرنے کی ذہنیت سے متعلق بیان دے کر اُنہوں نے کس کی ترجمانی کی ہے۔ وہ اُسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو امریکا کو کسی بھی قیمت پر اور کسی بھی حالت میں دُنیا کے طاقتور ترین ملک کے روپ میں دیکھنے کا خواہش مند تھا۔ جو لوگ امریکا کو دنیا پر حکمرانی کے قابل ریاست بنانے کی راہ پر گامزن ہوئے تھے اُنہیں اچھی طرح اندازہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ طاقت کے حُصول کا راستہ دوسروں کی طاقت میں کمی کی طرف جاتا ہے۔ کوئی طاقتور اُسی وقت ہوتا ہے جب کوئی اور کمزور ہوتا ہے۔ ہر دور میں چند ممالک نے معظّم ہو کر اپنی طاقت میں اضافہ اُسی وقت ممکن بنایا ہے، جب بہت سے دوسرے ممالک کو شدید کمزوری سے دوچار کیا گیا۔ اور معاملہ دوسروں کو کمزور کرنے تک محدود نہیں۔ اپنے آپ کو طاقتور رکھنے کے لیے دوسروں کو مستقل کمزور رکھنا بھی ناگزیر ہے۔ جب کسی ریاست کو زیادہ سے زیادہ طاقت حاصل کرنا ہو تو اُس کی پالیسیوں میں بھی یہ مقصد واضح طور پر در آتا ہے۔ امریکا نے ہر دور میں اپنی طاقت بڑھانے کو ترجیح اور ایسا کرنے پر توجہ دی ہے۔ اِس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے کہ خارجہ اُمور اور دفاع سے متعلق اُس کی تمام پالیسیاں کہیں نہ کہیں عسکری مہم جُوئی جاری رکھنے کو بنیادی مقصد قرار دینے پر مبنی رہی ہیں۔

جو لوگ امریکا کو استعماری قوت میں تبدیل کرنا چاہتے تھے اُن کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا کہ اپنے عزائم کو مکمل عملی شکل دینے کے لیے ایسی باتیں کُھل کر کریں جن سے لوگوں کا ذہن جنگِ آزادی کے دوران سامنے والے آئیڈیلز سے ہٹ جائے۔ یہ کوئی ایسا کام نہ تھا کہ ایک آدھ کوشش سے یا راتوں رات ہو جاتا۔ لوگوں کے ذہنوں کو مُسخّر کرنا اور اُن کی سوچ میں اپنی مرضی کے مطابق تبدیلی لانا محنت طلب کام تھا۔ امریکی قائدین نے اہلِ وطن کے ذہن تبدیل کرنے کے لیے بھی جامع اور بے داغ قسم کی منصوبہ بندی کی۔ آزادی سے وابستہ تمام تصورات یا آئیڈیلز کو رفتہ رفتہ ذہنوں سے دیس نکالا دیا گیا اور ایک ایسے امریکا کا خواب آنکھوں میں سجایا گیا جو دُنیا کو بہت کچھ دینا چاہتا تھا، ''تہذیب'' سکھانا چاہتا تھا اور جس کی مساعی کے بغیر یہ دُنیا رہنے کے قابل نہیں ہو سکتی تھی!

جنگ کو ناگزیر قرار دینے پر اِس قدر زور دیا جانے لگا کہ ایک عام امریکی بھی یہی سوچنا لگا کہ اقوامِ عالم میں اپنی دھاک بٹھانے اور کچھ کر دکھانے کے لیے عالمی سیاست و اقتصادیات کو اپنی مرضی اور ضرورت کے سانچے میں ڈھالنا ناگزیر ہے۔ اور یہ کہ ایسا کرنے کے لیے جنگ کی راہ سے ہو کر گزرے بغیر چارہ نہیں۔

تھیوڈور روز ویلٹ کو دوسری اقوام پر جنگ مُسلّط کرنے کے معاملے میں زیادہ انتظار کی زحمت بھی نہیں اُٹھانا پڑی۔

جس زمانے میں امریکی قائدین نے استعماری قوت بننے کے بارے میں اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا تب برطانیہ، فرانس، پرتگال اور اسپین کا شمار بڑی نوآبادیاتی قوتوں میں ہوتا تھا۔ اِن یورپی ممالک نے ایشیا، افریقا اور جنوبی امریکا میں بہت کچھ اپنی مُٹّھی میں کر رکھا تھا۔ امریکا چاہتا تھا کہ چند ایک ممالک اُس کی مُٹّھی میں بھی آ جائیں۔ یہ، ظاہر ہے، ایسا آسان تو نہ تھا کہ محض سوچنے سے ہو جاتا۔ امریکا کو استعماری سُپر پاور میں تبدیل کرنے کا خواب دیکھنے والوں کو بھی اندازہ تھا کہ کسی بھی خطے میں عسکری مہم جوئی کوئی بچوں کا کھیل نہیں۔ نوآبادیاتی قوت بننے کا عمل لوہے کے چنے چبانے جیسا تھا۔ لازم تھا کہ ہر معاملے کے تمام پہلوؤں کا عمیق جائزہ لے کر جامع حکمتِ عملی اپنائی جائے تاکہ ناکامی کے امکان کو زیادہ سے زیادہ کم کیا جا سکے۔

پہلے مرحلے میں امریکیوں نے ایسے خطوں کی طرف دیکھنا شروع کیا جہاں کمزوریاں تھیں۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں یورپی نوآبادیاتی قوتیں زیادہ مستحکم اور بہتر حالت میں نہ تھیں۔ اسپین کے لیے اپنی قوت برقرار رکھنا انتہائی دُشوار ثابت ہو رہا تھا۔ وہ اندرونی کمزوریوں کے باعث بیرونی سطح پر بھی اپنی کمزوریوں کو دُنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھنے میں کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ ایسے میں امریکیوں نے ہسپانوی نوآبادیات پر نظریں

جمانا شروع کر دیا۔ جن ہسپانوی نوآبادیات پر امریکی قائدین کی رال ٹپکی اُن میں کیوبا اور فلپائن سب سے نمایاں تھے۔ یُوں امریکی قائدین نے اپنے ملک کو استعماری قوت میں تبدیل کرنے کے پہلے مرحلے میں اسپین کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اسپین میں باغی فوجیں الگ ریاست قائم کرنے کے لیے لڑ رہی تھیں۔ یہ تو امریکا کے لیے "اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں" جیسا معاملہ تھا۔ امریکی قائدین نے صورت حال کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہسپانوی باغیوں کا دامن تھام لیا۔ اسپین کے باغی امریکا کے لیے بہترین حلیف ثابت ہوئے۔ جب امریکا نے ہسپانوی باغیوں کو گلے لگایا تو ہسپانوی حکومت اور فوج کمزور ہوتی چلی گئی۔ اسپین کی نوآبادیات میں بھی آزادی کی لہر اُٹھی۔ اندرونی شکست و ریخت اور کمزور سیاست و معیشت کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اسپین تیزی سے جنگ ہار گیا۔ اِس پر دنیا کو کم ہی حیرت ہوئی۔

اسپین کو ہرانے کے بعد امریکا کو اپنے عزائم بے نقاب کرنے میں کچھ بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ امریکی قیادت نے اعلان کیا کہ فتح حاصل کرنے کے بعد اب امریکی فوجی فلپائن سے آسانی سے نہیں ہٹیں گے۔ یہ اس بات کا اعلان بھی تھا کہ امریکا نے استعماری قوت بننے کا صرف ارادہ نہیں کر لیا بلکہ اُس پر عمل کرنے کی لگن اور بھرپور سکت بھی رکھتا ہے۔

فلپائن کو زیرِ نگیں کرنے کے بعد انڈیانا سے تعلق رکھنے والے سینیٹر البرٹ بیورج نے کہا۔ "اب فلپائن ہمیشہ کے لیے ہمارا رہے گا۔ اور فلپائن سے ذرا سا آگے چین کا بہت بڑا بازار ہے۔ ہم بحرِ اوقیانوس کے کنارے رہتے ہیں مگر اب بحرالکاہل ہی ہمارا بحر ہے۔ جو طاقت بحرالکاہل پر راج کرے گی پوری دنیا پر اُس کا غلبہ قائم ہوگا۔ اب بحرالکاہل پر اقتدار کی لگام ہمیشہ امریکا کے ساتھ میں رہے گی"۔

البرٹ بیورج نے جو کہا اُس میں نیا کچھ بھی نہیں تھا۔ دنیا کو اندازہ تو ہو ہی چکا تھا کہ اب امریکا عسکری مہم جوئی کے ذریعے زیادہ سے زیادہ ممالک کو اپنے دائرۂ اثر میں لینے کی تیاری کر رہا ہے۔ تمام کمزور ممالک کو انتہائی بُرے حالات کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا تھا۔ یُوں بھی یہ اُن کے لیے بالکل نئی صورت حال نہ تھی۔ وہ استعماری قوتوں کو بھگتتے آئے تھے۔ فرق صرف اِتنا تھا کہ اب کے استعماری قوت کا تعلق یورپ سے نہیں تھا۔

نوآبادیاتی نظام کے احیاء کی باتیں کی جانے لگیں۔ واشنگٹن چونکہ دارالحکومت تھا اِس لیے وہاں بھی اِن باتوں کا پھیلنا غیر فطری اور حیرت انگیز نہ تھا۔ نوآبادیاتی نظام کا جواز پیش کرنے کے لیے نسل پرستی اور دیگر عِلّتوں پر مشتمل نظریات پیش کیے جانے لگے۔ اور اِن نظریات کو واشنگٹن میں کُھلے دِل سے، بابیں پسار کر قبول کیا جانے لگا۔ سفید فام امریکیوں کی ذہن سازی کی جا رہی تھی۔ اُنہیں ایک ایسے دور کے لیے تیار کیا جا رہا تھا کہ جس میں امریکا کو طاقت کے فقید المثال استعمال کے ذریعے بہت کچھ الٹنا اور پلٹنا تھا۔ اِس معاملے میں نسل پرستی کو ذہن سازی کے حوالے سے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا۔ سفید فام امریکیوں کے ذہنوں میں یہ بات پوری شِدّت سے ٹھونس دی گئی کہ حکمرانی صرف اُن کا حق ہے اور ہر معاملے میں قائدانہ کردار قُدرت نے صرف اُن کے مقدر میں لِکھ دیا ہے۔

انڈیانا کے سینیٹر البرٹ بیورج نے کہا۔ "ہم جس نسل سے تعلق رکھتے ہیں اُسے دنیا پر راج کرنا ہے۔ ہمیں یہ مشن (!) خدا نے سونپا ہے اور ہماری نسل اِس مشن کو کبھی نہیں بھولے گی۔ اِس دنیا پر کسی کو تو، بلاشرکتِ غیرے، حکمرانی کرنا تھی اِس لیے خدا نے ہمیں منتخب کیا ہے۔ خدا ہی نے ہم میں پوری دنیا پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت پیدا کی ہے اور ہمیں دنیا کے ہر خطے پر راج کرنے کا مُنز سکھایا ہے۔ اب ہم وحشی، غیر مہذّب لوگوں پر قابو پانے کی صلاحیت اور سکت بھی رکھتے ہیں"۔

البرٹ بیورج کے الفاظ میں وہی دعویٰ ہے جو یہودی آج تک کرتے آئے ہیں یعنی یہ کہ وہ خدا کے پسندیدہ ترین بندے ہیں اور اُنہیں اِس دارِ فانی پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ البرٹ بیورج نے سفید نسل کے بارے میں یُوں رائے دی ہے جیسے وہ حرفِ آخر ہو۔ سفید فام نسل کو باقی دنیا سے بہتر اور افضل قرار دینے کی سوچ ہی نے امریکا کے ہاتھوں اِس قدر بگاڑ کی راہ ہموار کی ہے۔ امریکی قائدین نے جب آزادی کے بعد ذرا حواس بحال کیے تو سفید فام امریکیوں کو یقین دلانا شروع کیا کہ اب اُنہیں صرف امریکا نہیں بلکہ پوری دُنیا پر راج کرنا ہے۔ سفید فام امریکیوں کو یہ یقین دلایا گیا کہ وہ دوسری تمام نسلوں اور اقوام سے واضح طور پر بہتر اور مہذّب ہیں۔ یعنی یہ کہ اُنہیں باقی دنیا کو سکھانا ہے کہ بہتر زندگی کس طور بسر کی جا سکتی ہے اور کی جانی چاہیے۔

البرٹ بیورج نے سفید فام امریکیوں کو برتر نسل ہونے کا یقین دلانے کے لیے خدا کا حوالہ دینا بھی ناگزیر جانا تاکہ سفید فام امریکیوں کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ یہودی نہیں بلکہ وہ خدا کے پسندیدہ اور منتخب بندے ہیں۔ آخر میں البرٹ بیورج نے صرف سفید فام امریکیوں کو مہذّب اور باقی سب کو وحشی اور غیر مہذّب قرار دے کر گویا قلم توڑ کر رکھ دیا ہے! اِن الفاظ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ امریکی قائدین بیشتر اور بالخصوص سفید فام امریکیوں کے ذہنوں میں کیا ٹھونسنا چاہتے تھے۔ اور یہ کہ ایسا کرنے کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ ذہنوں میں کجی پیدا کرنے ہی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ آج امریکی پالیسیوں میں خود کو برتر سمجھنے کے ساتھ ساتھ دوسروں کو کمتر، جاہل اور غیر مہذّب سمجھنے کا احساس ممکنہ شِدّت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ کسی ملک یا علاقے پر بیرونی افواج حملہ کریں اور کوئی مزاحمت ہی نہ کی جائے یعنی حملہ آوروں سے مرعوب ہو کر خاموشی اختیار کی جائے۔ انتہائی کمزور اقوام بھی تھوڑی بہت مزاحمت تو کرتی ہی ہیں۔ فلپائن کے لوگ سینیٹر البرٹ بیورج اور اُن کے معتقدین کی باتوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ یہ بات کیوں گوارا کرتے کہ اُن کے ملک پر حملہ کیا جائے، اُن کی سرزمین پر قبضہ کر لیا جائے؟

جب امریکی فوج نے فلپائن پر لشکر کشی کی تو اُسے ویسی ہی مزاحمت کا سامنا کرنا جیسی مزاحمت کا سامنا اسپین کی فوج کو کرنا پڑا تھا۔ امریکی افواج نے جب یہ دیکھا کہ مزاحمت کاروں پر قابو پانا اور اُنہیں اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں تو اُنہوں نے فلپائن میں مزاحمت کچلنے کے لیے غیر معمولی حد تک طاقت استعمال کی۔ امریکا کی یہ روش کسی بھی اعتبار سے قابلِ قبول قرار نہیں دی جا سکتی تھی۔ اِس کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر قتلِ عام ہوا، پورا ملک شدید عدم استحکام کی نذر ہوا، معیشت اور معاشرت دونوں کا سبھی کچھ الٹ پلٹ کر رہ گیا۔ اور فلپائن کے لوگوں کو بالآخر امریکا کی غیر معمولی طاقت کے سامنے سَر جُھکانا پڑا۔ امریکی فوجیوں کو حکم دیا گیا کہ سب کو جلا دو، سب کو مار ڈالو۔ اور اُنہوں نے اِس حکم کی تعمیل کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ جو بھی ہاتھ آیا اُسے موت کے گھاٹ اتارنے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی گئی۔ جب فلپائن کی فوج نے ہتھیار ڈالے تب تک ۶ لاکھ سے زائد فلپائنی مارے جا چکے تھے۔ ملک تباہ ہو چکا تھا۔ معیشت کا کچھ ٹھکانہ نہ تھا، معاشرے میں ایسا عدم استحکام تھا کہ کسی کو کچھ اندازہ نہیں تھا کہ اب کیا کرنا ہے، کس سمت جانا ہے۔ امریکیوں نے طاقت کے زُعم میں فلپائن کا سبھی کچھ برباد کر کے رکھ دیا تھا۔

باقی صفحہ نمبر ۵